نیا دور

اشاعت کا ۹۷واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

ستمبر ۲۰۱۹ء

۱۵؍روپئے

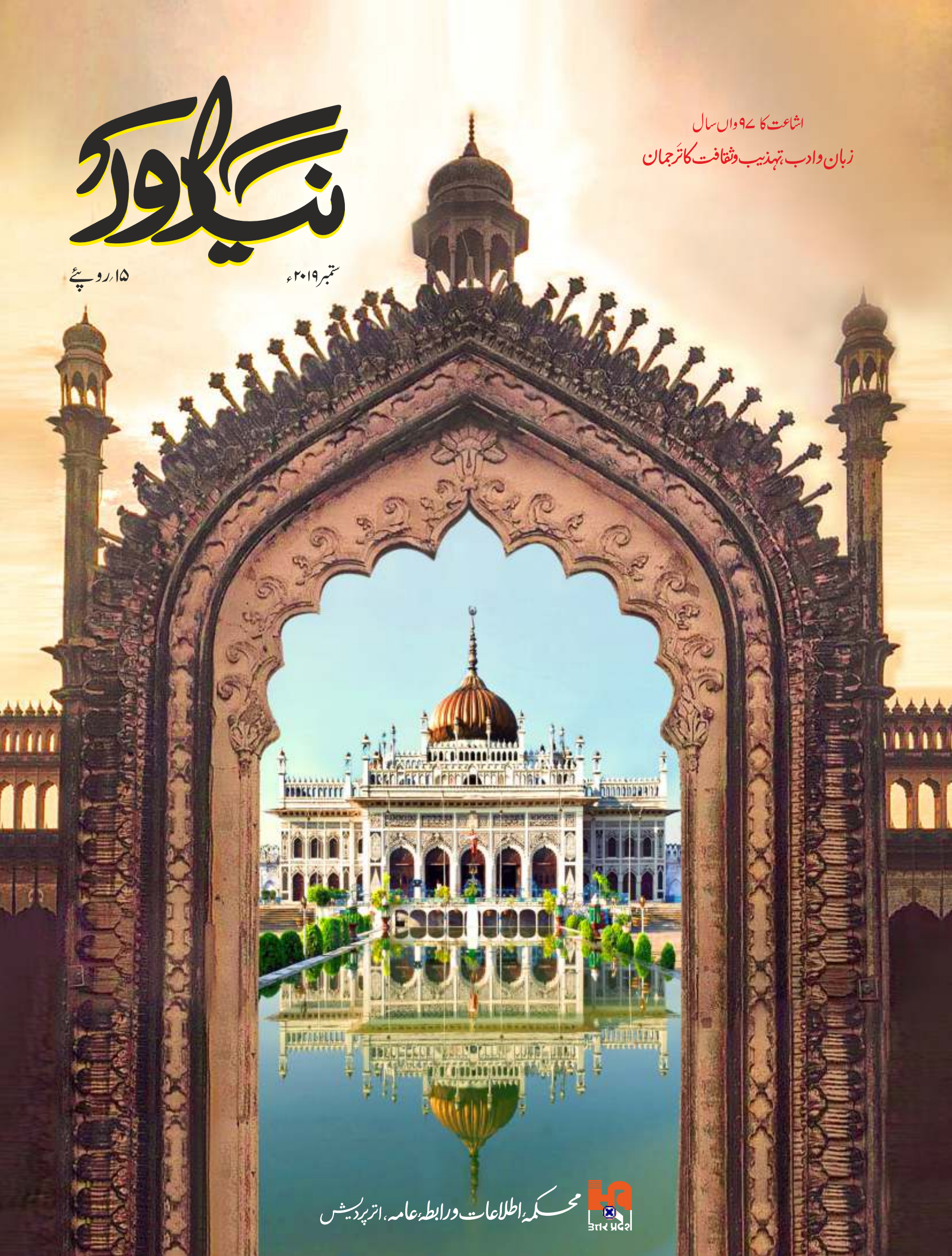

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی موجودگی میں راج بھون میں
رئیل اسٹیٹ اپیلیہ ٹریبیونل کے نومنتخب چیئرمین جسٹس دیویندر کمار اروڑا کو عہدہ اور راز داری کا حلف دلاتے ہوئے (۳؍ستمبر ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اپنی سرکاری رہائش گاہ پر محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ
کی جانب سے شائع شدہ کتاب 'وکاس اور سشاسن کے تیس ماہ' کا اجراء کرتے ہوئے (۱۹؍ستمبر ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اتر پردیش پولیس ڈائرکٹریٹ کی گومتی نگر ایکسٹینشن
واقع نئی عمارت کے اجراء کے موقع پر پولیس کے اعلیٰ افسران کے ساتھ (۲؍ستمبر ۲۰۱۹ء)

جلد : ۷۴ شمارہ:۵

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

ستمبر ۲۰۱۹ء

پبلشر: ششر

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ

غزال ضیغم ، انجم نقوی

ایڈیٹر

سید عاصم رضا

فون: 9936673292

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ۲

مضامین

دبیریت کیا ہے ..... پروفیسر فضل امام ۳

جدید مرثیہ کا پس منظر اور جوش ..... پروفیسر علی احمد فاطمی ۷

بیانیہ اور انیس ..... پروفیسر نیر جلالپوری ۱۲

نوحوں کا ایک گمنام شاعر ثریا ..... وقار ناصری ۲۰

شارب ردولوی کی رثائی تنقید ..... ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق ۲۲

مرزا محمد اشفاق شوق کی رثائی شاعری ..... پروفیسر طلعت حسین نقوی ۲۶

رثائی ادب کے دلنشیں سخنور: نیر سلطانپوری ..... انجینئر در الحسن ۲۹

خاندان اجتہاد کی عزائی خدمات ..... اسیف جائسی ۳۱

بہار میں اردو مرثیہ کا تاریخ ساز سفر: ایک تجزیہ ..... ڈاکٹر محمد ارمان ۳۳

انٹرویو

حسینیت تو ہماری رگوں میں دوڑتی ہے ..... طارق قمر ۳۶

گوشۂ مسرور جہاں

آہ! مسرور باجی ..... عطیہ پروین ۳۸

میری بجّو ..... وقار ناصری ۴۰

مسرور جہاں؛ شخصیت کے آئینے میں ..... ڈاکٹر پروین شجاعت ۴۲

نعت

نیر سلطانپوری ..... ۴۵ کرشن گوتم ۴۵

سلام

مولانا شمیم الحسن، کاظم جرولی ..... ۴۶ صہبا جرولی، مصطفیٰ زیدی ۴۷

مولانا ضمیر الحسن، جرار اکبر آبادی ..... ۴۸ کوثر زیدی لکھنوی، نصیر اعظمی ۴۹

محب مورانوی، پروفیسر عزیز حیدر ..... ۵۰ ندیم صدیقی، عبرت مچھلی شہری ۵۱

نایاب ہلوری، احسن نونہروی ..... ۵۲ ضمیر سید پوری، عبدالقیوم فرقت ۵۳

رزمی سلطانپوری، کوثر پروین کوثر ..... ۵۴ منور سلطانپوری، کوثر زیدی ۵۵

سخنئے مصر اشوق (قطعات) ۵۶

نوحے

نجم آفندی ..... ۵۸ افشاں مہدی ۵۸

مرثیہ

گھر سے جب بہر سفر سید عالم نکلے ..... میر ببر علی انیسؔ ۵۷

ترقیات

اتر پردیش ایک کھرب کی معیشت بننے کی جانب گامزن ..... نجیب انصاری ۵۹

تبصرے

کوہ نور (ڈاکٹر مسعود ردولوی) ..... پروفیسر انیس اشفاق ۶۲

صبح خورشید زوال (پروفیسر انیس اشفاق) ..... ڈاکٹر ظفر النقی ۶۳

گلدستۂ مودت (عباد حسین عابدی عابدؔ سلطانپوری) ..... موسیٰ رضا ۶۴

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

ستمبر 2019 کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس شمارے کی چند خاص اہمیتیں ہیں۔ نیا دور ہر سال محرم کے سلسلے میں خصوصی طور پر کچھ مضامین شائع کرتا رہا ہے۔ اس شمارے میں 9 مضامین 1 مرثیہ 21 سلام وقطعات اور 2 نوحے شائع کئے جارہے ہیں۔ محرم دنیا کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہے جس پر نثر ونظم میں صدیوں سے لکھا جارہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ ہم سو سال پہلے کی تاریخ دیکھیں یا دوسو سال پہلے کی یا قلی قطب شاہ کے زمانے میں چلے جائیں جب اردو زبان اپنے تشکیلی دور میں تھی، تب بھی رثائی ادب تھا۔ قلی قطب شاہ کا یہ شعر سب کے ذہنوں میں ہوگا:

حسین کا غم کرو عزیزاں
انجھوں نین سوں جھرو عزیزاں

ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ جیسے جیسے زبان فصاحت وبلاغت کے مدارج طے کرتی گئی اظہار کی نوعیت بھی بدلتی گئی۔ غرض یہ غم یا یہ واقعہ ایسا ہے کہ جس پر ہر عہد میں لکھا گیا اور صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ ہر مذہب اور عقیدے کے لوگوں نے اظہار خیال کیا۔ ہم اکثر آزادی کی تحریک کے سلسلہ میں گاندھی جی کا حوالہ دیتے رہے ہیں کہ ان سے جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ نمک آندولن میں صرف 72 آدمی لے کر کیوں جارہے ہیں تو انھوں نے کہا تھا کہ امام حسین اور واقعہ کربلا کی پیروی میں۔ اس شمارے کا دوسرا اہم حصہ گوشہ مسرور جہاں پر ہے۔ مسرور جہاں کے انتقال کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے۔ وہ اردو کی ایک اہم فکشن رائٹر تھیں انھوں نے اپنے ادبی سفر میں تقریبا 65 ناول اور سینکڑوں افسانے لکھے۔ اردو فکشن کہ تاریخ پر اگر نگاہ ڈالیں تو مسرور جہاں سے زیادہ ناول لکھنے والی کوئی خاتون نہیں ملے گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے انھوں نے اپنے شب وروز اردو ناول اور افسانے کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ ان کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے پھیلے ہوئے حالات اور سچائیوں کی باتیں کرتی ہیں۔ ان کے یہاں افسانے ہوں یا ناول مڈل کلاس سوسائٹی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم انکے کرداروں سے واقف ہیں۔

رثائی ادب کے حصہ کا پہلا مضمون دبیریت کیا ہے، مشہور ناقد ومحقق پروفیسر فضل امام صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ انیس ودبیر اردو شاعری خاص طور پر اردو مرثیے کے سب سے اہم شاعر ہیں اور مرثیے کے ذکر کے ساتھ سب سے پہلے ہمارے ذہنوں میں انھیں کے نام آتے ہیں۔ اس شمارے میں دونوں کے مرثیوں پر مضامین کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ دونوں عہد ساز شاعروں کا یکجا مطالعہ کیا جاسکے میر انیس پر پروفیسر نیر جلالپوری کا مضمون انیس کے بیانیے سے متعلق ہے۔ مشہور ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی کا مضمون جدید مرثیے کے حوالے سے جوش ملیح آبادی کے مرثیوں پر ہے۔ جدید مرثیہ اپنی ایک الگ اہمیت اور شناخت رکھتا ہے جبکہ نفس مضمون قدیم وجدید مرثیوں میں واقعہ کربلا ہی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ انداز فکر بھی تبدیل ہوتا ہے اور اظہار بھی بدلتا ہے اس لئے قدیم یا کلاسیکی مرثیوں کے ساتھ جدید مرثیوں کے مطالعہ کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جناب وقار ناصری نے نوحوں کے ایک گمنام شاعر ثریا پر مضمون قلمبند کیا ہے۔ یہ ایک اہم تحقیقی مضمون ہے مرثیہ یا نوحے سبھی جگہ لکھے گئے لیکن ہم ان تمام لکھنے والوں تک نہیں پہنچ سکے۔ وقار ناصری نے بڑی تلاش وجستجو کے بعد ثریّا کا کلام حاصل کیا اور اس پر مضمون لکھنے کی زحمت کی۔ اس

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی
نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال
واٹس اپ اور ویب سائٹ پر
قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جارہے ہیں

کے بعد چار مضامین شخصیت اور خانوادوں سے متعلق ہیں یعنی مرزا اشفیق حسین شفق کا مضمون شارب ردولوی کی رثائی تنقید، پروفیسر طلعت حسین نقوی کا مضمون مرزا محمد اشفاق شوق کی کربلا، جناب درالحسن کا مضمون رثائی ادب کے دل نشیں سخنور نیر سلطانپوری، جناب اسیف جائسی کا مضمون خاندان اجتہاد کی رسائی خدمات، یہ تمام مضامین بیحد اہمیت کے حامل ہیں۔ شارب ردولوی مشہور ناقد ہیں ان کی کئی کتابیں مرثیے اور رثائی ادب کے موضوع پر شائع ہوچکی ہیں۔ ڈاکٹر شفق نے ان کی رثائی تحریروں کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے۔ مرزا محمد اشفاق شوق اردو کے اہم شاعر اور مرثیہ نگار تھے ان کو کربلا سے کس درجہ عقیدت تھی اور کس طرح انھوں نے کربلا اور کربلا والوں کا اظہار اپنی شاعری اور اپنے مرثیوں میں کیا، اس کی اہمیت پر پروفیسر طلعت حسین نقوی نے تفصیل سے اپنے مضمون میں روشنی ڈالی ہے۔ نیّر سلطانپوری کی رثائی شاعری کا تجزیہ جناب درالحسن نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ نیّر سلطانپوری ایک اہم شاعر تھے جو اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن ان کے قصائد، نوحوں اور قطعات بھی کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان میں ایک وافر حصہ رثائی ادب کا ہے جس پر جناب درالحسن نے بہت اچھے انداز سے اپنے مضمون میں روشنی ڈالی ہے۔ خاندان اجتہاد میں بہت سے اہم مرثیہ گوگزرے ہیں اور اردو شعرو ادب میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔ جناب اسیف جائسی نے خاندان اجتہاد کی عزائی خدمات کا جائزہ اپنے اہم مضمون میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ارمان کا مضمون بہار میں اردو مرثیہ کا تاریخ ساز سفر اپنے موضوع کے لحاظ سے خود بہت اہمیت رکھتا ہے بہار میں ابتدا سے رثائی شاعری کے نقوش ملتے ہیں وہ شاد عظیم آبادی کا عہد ہو یا جدید شاعر جمیل مظہری کا۔ ہر عہد میں ایسے بہت سے شعرا ہیں جن کی رثائی ادب میں خدمات ناقابل فراموش ہے۔

گوشہ مسرور جہاں میں عطیہ پروین، وقار ناصری، ڈاکٹر پروین شجاعت کے مضامین مسرور جہاں کی شخصیت اور افسانہ نگاری سے تعلق رکھتے ہیں ان مضامین کے ذریعہ کچھ بہت اہم ذاتی باتوں کا پتہ چلتا ہے کہ مسرور جہاں کا برتاؤ اپنے ہم عصر لکھنے والوں اور نئی نسل کے قلمکاروں کے ساتھ یا گھر کی چہار دیواری کے ساتھ۔ یہ مضامین اس لئے اہم اور دلچسپ ہیں کہ ان کے ذریعہ ایک بڑی قلمکار اور ادیبہ کی اس شخصیت سے ملاقات ہوتی ہے جس سے ہم قطعی واقف نہیں ہوتے۔ وہ قلمکار کے ساتھ بہن بھی ہیں ماں بھی نانی اور دادی بھی دوست اور رشتہ دار بھی۔ ظاہر ہے جب ہم ان نوعیتوں سے اپنے کسی پسندیدہ ادیب اور افسانہ نگار کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کی کچھ زیادہ خوبصورت تصویر نظر آنے لگتی ہے یہی نوعیت وقار ناصری کے مضمون میری بجّو عطیہ پروین کے مضمون آہ! مسرور باجی اور پروین شجاعت کے مضمون مسرور جہاں شخصیت کے آئینہ میں (انٹرویو)، کی ہے۔ اس کے علاوہ طارق قمر کا مشہور گلوکارہ حسینی برہمن سنیتا جھنگرن کا انٹرویو ہے۔ اترپردیش کی معیشت پر نجیب انصاری کا مضمون اور اہم کتابوں پر تبصرے شامل اشاعت ہیں۔ مجھے امید ہے کہ گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو پسند آئیگا۔

ایک بات:

تہذیبیں خود فروغ نہیں پاتیں ان کا گہرا رشتہ زبان سے ہوتا ہے جو زبان نہیں رہتی اس کی تہذیب بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اپنی زبان کی حفاظت کیجئے اسے فروغ دیجئے تاکہ آپ کی تہذیب بھی باقی رہے۔

پروفیسر فضل امام
امامیہ مارگ، جعفریہ کالونی، مفتی گنج، لکھنؤ
موبائل: 9415316152

دبیریت کیا ہے

عام طور سے ناقدین اردو ادب دبیرؔ کو ثقالت پسند، طوالت عزیز اور غیر ثقہ روایات کا نظم کرنے والا مرثیہ گو کہتے ہیں۔ دبیرؔ کے کلام پر اس انداز کی تنقید اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ہمارے ناقدین ادب سہل نگاری میں یقین رکھنے کے عادی رہے ہیں۔ چند مفروضہ امتیازات کے چوکھٹوں میں انیسؔ و دبیرؔ کے شاعرانہ اکتسابات کا احاطہ کرنے والے غالباً اردو شعر و ادب کو انتہائی محدود و مسدود متصور کرتے ہیں حالانکہ ادب کا غائر مطالعہ عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ ساتھ دل سوزی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ دبیرؔ ایک ایسا ہی شاعر تھا جو بدنصیبی سے مرثیہ گو بھی تھا۔ فی الحال مجھے یہاں مرثیہ گوئی کی نہ تو تاریخ بیان کرنی ہے اور نہ صنف سخن کے لحاظ سے اس کے دائرۂ کار کا تعین کرنا ہے۔ بحث صرف اس قدر ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے اودھ کے مشہور و معروف محاورے میں 'دبیریت' کہا جاتا ہے۔

مختصر طور پر یہیں یہ بات بھی عرض کرنی ضروری ہے کہ ہمیں سب سے پہلے مرثیہ کے موضوعات، محرکات، اسباب و علل، علت و معلول پر گہرائی سے غور و فکر کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس صنف سخن کے زیر اثر مرثیہ نگاروں پر نتیجہ خیز بحث ہو سکتی ہے۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ہم لوگ پہلے نظریہ قائم کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور نظر بعد میں پیدا کرتے ہیں۔ یہی سب ہے کہ ہمارے نظریات تارِ عنکبوت سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے ہیں۔ دبیرؔ کے متعلق بھی اسی انداز کے نظریات روا رکھے گئے ہیں لیکن دبیرؔ کا تجزیاتی مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ درحقیقت دبیریت فکر و فن کے اس تدبر کا نام ہے جو ذہن انسانی کے سوتوں کو آب زلال میسر کرتا ہے۔ وجدان و آگہی کی اس قسمت کا نام 'دبیریت' ہے۔ جہاں ہمارے تفکر و تفلسف کی امکانی سرحدوں کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ 'دبیریت' نام ہے نمو و فن کی اس رفعت کا جہاں فنی بصیرتوں اور جدید وسعتوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ 'دبیریت' نام ہے اس دقت نظر کا جو فن کی تقدیر بھی ہے اور تجزیہ بھی۔ 'دبیریت' نام ہے فن کی اس وادیٔ پرخار کا جہاں خس خانۂ مژہ سے نگاہوں کو باہر نکال کر کڑی دھوپ کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ 'دبیریت' نام ہے شدت جذبات، نزاکت احساس، دقت نظر اور دقیقہ سنجی کے اس دبیز پردے کا جسے علم و فن کی بصیرتوں کا رازدار ہی اپنے ہاتھوں سے ہٹا سکتا ہے۔ اب یہاں اس اجمال کی تفصیل کا ایک مختصر لیکن مقصدی جائزہ درپیش ہے۔

تنقید دبیر کے سلسلہ میں دبیر کی زبان اور انداز بیان کو مشکل اور عوام کے بجائے خواص اور خواص میں بھی ایک مخصوص طبقے کے رونے رلانے کے لئے بتایا گیا ہے۔ تنقید دبیرؔ کا یہ نتیجہ دلچسپ بھی ہے اور کافی حد تک مضحکہ خیز بھی۔ دلچسپ اس لئے کہ زبان اور انداز بیان کی مشکل پسندی کے باعث دبیرؔ کا کلام عوام سے علاحدہ ہو کر صرف ایک مخصوص طبقہ کے رونے رلانے کا سبب بن گیا یا رونے کے سبب سے صرف ایک طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر زبان اور اندازِ بیان کی مشکل پسندی سبب علاحدگی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ خود اقبالؔ اور مرثیہ خواں میر انیسؔ کا بھی بعض کلام ایسا ہی ہے۔ خاص طور سے بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کا اقبال عام فہم نہیں ہے بلکہ بہت مشکل پسند ہے اور آج تو غالب، اقبال، انیس اور دبیر کے کلام کا صحیح طور پر ادا کرنا ہی ایک امتحان ہے۔ سودا اور ذوق کے قصائد بھی اسی ذیل میں آجاتے ہیں تو کیا ان سب شعراء کی کاوشیں علاحدگی اور کسی خاص طبقہ کا مطالبہ کرتی ہیں؟ اور اگر سبب گریہ و بکا ہی عوام سے علاحدہ کرتا ہے تو اس نقطۂ نظر سے صرف دبیر ہی نہیں بلکہ انیس بھی اور انیسؔ ہی نہیں بلکہ مرثیہ صنف سخن کی حیثیت سے یہی مطالبہ کرتا ہے چاہے وہ لغوی معنوں میں کچھ بھی مروج ہو جائے لیکن جب لفظ مرثیہ کو ہم صنف سخن کے اعتبار سے مطالعہ کرتے ہیں تو جنوبی ہند سے شمالی ہند تک اور پھر اودھ میں مختلف مدارج اور منازل میں نظر آتا ہے۔ پھر بھی یہ اعتبار صنف سخن شخصی مرثیوں میں بھی مرکزی نقطۂ نظر رونا رلانا ہی رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صفات ذات کا تذکرہ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو اور دل اور دل سے آہ ضرور نکل جائے گی۔ اس لئے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مرثیہ ایک فطری اور عین فطری صنف سخن ہے۔

دبیرؔ خالص مرثیہ گو شاعر ہے اس لئے 'دبیریت' کا اصل مفہوم مرثیت میں پنہاں ہے اور بس یہی سبب ہے کہ مرثیہ گویوں کی طویل فہرست میں مرزا دبیرؔ کا نام

سرفہرست آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انیسؔ نے بھی بین لکھے ہیں لیکن انیسؔ کا مرثیہ نگاری میں اصل تصور بینیہ اور حزنیہ نہیں ہے۔ انیسؔ کی مرثیہ نگاری میں درد کی باتیں صرف اس لئے ہیں کہ مرثیہ اس پہلو سے نہ خالی رہ جائے:

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہوئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے
(انیس)

یعنی انیسؔ کے یہاں مرثیت کا تصور برائے بیت ہے جب کہ دبیرؔ مرثیہ کو اصل مفہوم میں پیش کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ 'بین' انیسؔ کے یہاں مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے یعنی مرثیہ کا جز ہے۔ اس سے قطع نظر دبیرؔ کے یہاں بین مرثیہ کے عناصر ترکیبی میں شامل ہے یعنی بین ہی اصل اور عین مرثیہ نگاری ہے۔ اس لئے بعض اوقات کچھ ایسی روایات بھی دبیرؔ نے نظم کر دی ہیں جن کے متعلق تامل ہے مگر ان روایات کا نظم ہو جانا کچھ ایسا غلط نہیں ہے کیونکہ شاعر مورخ نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے روایات چاہے ضعیف ہوں یا قوی، سب دامن تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ پہلے مورخین کا اجماع روایات کی سند کے لئے کوئی معیار مقرر کرے اس کے بعد اس معیار کی روشنی میں کوئی نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے۔

اصل گفتگو یہ ہے کہ کیا دبیرؔ نے جن جذبات کی جس انداز میں عکاسی کی ہے وہ انسانی زندگیوں سے دور ہیں؟ کیا ان میں فطری پن نہیں ہے؟ کیا رنج وغم کی فراوانی میں عام طور پر ان کوائف اور اقوال کو ہم اپنے گرد و پیش نہیں دیکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالات کی تردید لقمۂ تر نہیں ہے تو پھر اسے تسلیم کرنے میں کیوں قیل وقال ہے؟ دبیرؔ ان روایات کو نظم کرنے میں انسانی زندگی کے تصورات سے کنارہ کش نہیں ہوئے ہیں۔

یاد رہے کہ دبیرؔ نے عرب کے کرداروں کو اپنی نظر سے خود تو دیکھا نہیں تھا۔ تاریخ کے مطالعہ اور روایات کے علم، احادیث کی معرفت نے ان کرداروں تک دبیر کی رسائی کی تھی۔ دبیرؔ نے ان کی حرکات و سکنات، طور طریقہ، صورت و سیرت سب سے پہلے اپنے اوپر طاری کی ہوگی پھر اسے اپنے محسوسات سے کام لے کر مرثیہ میں پیش کیا ہے۔

واقعہ کربلا کے مختلف کردار، ان کی شجاعت، سخاوت، صبر و استقلال، بہادری اور دلیری، حرب و ضرب، زندگی و عبادت، رنج وغم، مسرت اور انبساط وغیرہ مافوق الفطرت نہیں بلکہ عین فطری ہیں۔ یہ تو دبیریت ہے جس نے جذبات وحیات انسانی کے تمام تر محسوسات اور ان کی دھڑکنوں کو اپنے مرثیہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ شدت جذبات کو منطق اور ریاضی کے اصولوں سے ناپا نہیں جاسکتا ہے۔

موروثی کسی اور وہبی شاعری کی مروجہ اصطلاحات بھی بہت کچھ گمراہی کا سبب رہی ہیں۔ میں ماحول کے اثرات کا منکر نہیں لیکن یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جسے خاندانی طور پر شعروادب کا ماحول ملا ہو وہ بھی بڑا اچھا اور کامیاب شاعر ہو۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ بڑا اور عظیم شاعر وہی ہوگا جس کے باپ دادا بھی شاعر رہے ہوں۔

میرے خیال میں اسے کلیہ قطعی نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ دنیائے ادب کی تاریخ میں ورق گردانی کر کے مجھے کوئی بتا دے کہ یہ کلیہ ہے۔ میں سب سے بڑا کمال یہ سمجھتا ہوں کہ خود فرد، شخصیت میں علمیت پیدا کر کے اپنی انفرادیت کی چھاپ لگا دے۔

یہ بھی دبیر کا کمال ہے جس میں اسلاف کی عظمت کا طفیل نہیں۔ اب رہا مسئلہ کسی اور وہبی صلاحیتوں کا یہ ذہن نشین رہے کہ اگر کچھ چیزیں قدرت نے ودیعت کر دی ہیں۔ وہاب نے بخش دیں تو اس میں شخصیت کے کمال فن کی کیا بات رہی؟ قدرت نے عقل، احساس، شعور اور جذبہ عنایت کر دیا۔ اب جتنی زیادہ قوت کسب ہوگی اتنی ہی زیادہ اس کے علم وفن اور شعروادب کو تقویت حاصل ہوگی۔ شاعری کا تعلق براہ راست شاعر جذبات، احساسات اور فکر وفن سے ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے الہام کہہ کر سکون حاصل کرنے کے ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ دبیرؔ موروثی شاعر نہ سہی، دبیر وہبی شاعر نہ سہی لیکن وہ کسبی شاعر تو ہے۔ وہ اپنی دنیا کا خود معمار ہے۔ اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے اور اسی انفرادیت فن کو میں 'دبیریت' سمجھتا ہوں۔

موازنۂ انیس و دبیر میں شبلیؔ نے عجیب مضحکہ خیز انداز اختیار کیا ہے۔ تمہید کی ابتدائی سطروں میں لکھتے ہیں:

'بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ (انیس) اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دئے گئے اور مدت پائے دراز کی غور وفکر، کد وکاوش، بحث وتکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ترجیح کا مسند نشیں کس کو کہا جائے'

(موازنۂ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ۱۱)

اس کے بعد ہی شبلی دوسرے پیراگراف کی آخری سطروں میں لکھتے ہیں:

'اس کتاب میں میر انیسؔ کا موازنہ مرزا دبیرؔ سے کیا گیا ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے'

(موازنۂ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ۱۱)

شبلی کے متضاد بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ خود انیسؔ کو دبیر کے ہم پایہ سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زبان سے تسلیم کرنے میں وہ تاویل سے کام لیتے ہیں۔ دونوں شخصیتوں کے اندازِ فکر مختلف ہیں۔

اس لئے مختلف طبیعتوں کے افراد اپنے طور پر اظہار پسندیدگی کرتے ہیں۔اس سے بدمذاقی نہیں کہا جاسکتا ہے۔میں صاحب المیز ان کے مندرجہ ذیل خیال سے اتفاق کرتا ہوں:

'یہ دونوں بزرگ اردو شاعری میں بے مثل ولا جواب تھے اور ایک دوسرے پر ترجیح دینا جناب مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ وکعبہ کا قابل قبول فیصلہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کا کلام دقیق، ملیح اور میر صاحب کا کلام فصیح وشیریں ہے۔دونوں کا ذائقہ علاحدہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی کیونکہ بعض طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور طبائع شیرینی پر مائل ہیں۔'

(المیز ان، مولفہ چودھری سید نظیر الحسن فوقؔ رضوی، مطبوعہ فیض عام علی گڑھ، ص ۱۶)

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ موروثی شاعری یا موروثی فن کہہ کر افضلیت اور فوقیت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔شبلی نے موازنہ کے اوراق میں میر انیسؔ کے خصوصیات کلام کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

'میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی۔ان کے مرثیہ کے جو خاص جوہر ہیں وہ میراث ہی کی یادگار ہیں۔'

(موازنۂ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ۳۱)

مندرجہ بالا جملوں کا تجزیوں یوں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی۔

۲۔ ان کے مرثیہ کے خاص جوہر میراث ہی کی یادگار ہیں۔

یعنی انیس کا اپنا کوئی خاص جوہر نہیں کیونکہ خاص جوہر میراث ہی کی یادگار ہیں۔اس میں 'ہی' نے تو عجیب وغریب قدغن لگا دی ہے۔اس کے پیش نظر نتیجہ خیز گفتگو کر چکا ہوں۔

میرا اپنا خیال اور نظریہ یہ ہے کہ موروثی اور وہبی شاعری کی اصطلاحات غم غلط کرنے کے لئے استعمال ہوتی رہی ہیں۔اس لئے ترجیح کا مسئلہ بڑا ہی گھناؤنا ہے۔'یادگارِ غالب' میں غالبؔ کی رائے جو حالیؔ نے نقل کی ہے اس سے لے کر آزادؔ اور آج تک سبھی مصنف مزاج انیسؔ اور دبیرؔ کو برابر کا شاعر گردانتے رہے ہیں۔آزادؔ کا بیان واضح ہے جسے انہوں نے اعیسئے اور دبیریئے کے ذیل میں دیا ہے:

'اور منصفی بیچ میں آ کر کہتی تھی کہ دونوں اچھے، دونوں اچھے۔کبھی کہتے، وہ آفتاب ہیں، یہ ماہ، کبھی کہتے، یہ آفتاب وہ ماہ۔'

(آبِ حیات از مولوی شمس العلماء محمد حسین آزاد، ص ۵۰۷)

آزاد کا اندازِ تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو ان میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہے اور نہ حریف ہے بلکہ دونوں کا انداز فن کا نظریہ مختلف ہے۔اس لئے ترجیح کا مسئلہ حل نہ کرنا اور مسند نشینی کا مرحلہ طے نہ کرنا بدمذاقی نہیں ہے بلکہ کوئی قضیہ ہی نہیں ہے۔دونوں کا رنگ طرز ادا جدا ہے۔ہاں مسئلہ ترجیح کا پیدا کر دینا البتہ ثبوت بدمذاقی ہے۔

قریب المعنی بند کو بنیاد بنا کر شبلی نے تحریر کیا ہے:

'میر انیس کی شاعری کے متعلق یہ بات نہایت متہم بالشان ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ مرزا دبیر کی رقابت اور مقابلے نے ان کے کلام پر کیا اثر پیدا کئے۔اگر یہ پتہ لگ سکتا کہ دونوں حریفوں میں اول کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا اور خاص خاص مرثیہ بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے ہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں۔اول کس نے کہے؟ تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حاصل ہو جاتے لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جدوجہد کے اس بارے میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔دونوں حریفوں کے مرثیوں کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے لیکن زمانے کے تقدیم وتاخیر سے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے اور کس نے اثر لیا ہے۔میر انیسؔ جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے حریف کو سن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔اس کے ساتھ جب بعض مرثیوں سے ثابت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے پر لکھے گئے ہیں تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مقابلے اور ہم طرحی مطابقت کی کوشش مرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔'

(موازنۂ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ۳۲-۳۱)

مندرجہ بالا نکات کے متعلق صاحب المیز ان سے متفق ہوں کہ:

'تقدیم وتاخیر کا مسئلہ حل کرنا جس قدر دشوار ہے اسی طرح غیر ضروری بھی ہے۔دونوں صاحبوں کے محاسن کلام سے بحث کرنا اصل مقصود ہے خواہ کسی نے پہلے شاعری شروع کی ہو۔'

(المیز ان، مولفہ چودھری سید نظیر الحسن فوقؔ ص ۲۳)

اس سے بحث کرنا اور اس مسئلہ میں الجھنا قطعی غیر ضروری ہے لیکن تقدیم وتاخیر کا مسئلہ اس عہد کی مشہور اور ترجمان تصنیف 'فسانۂ عجائب' از رجب علی بیگ سرور سے کسی حد تک ضرور سلجھ جاتا ہے۔سرور نے ایک مقام پر مرثیہ گو شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'مرثیہ گو بے نظیر، میاں دلگیرؔ، صاف باطن،

نیک ضمیرؔ، خلیقؔ، فصیح و مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیرؔ، سکندر طالع بصورت گدا، بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا عرصۂ قلیل میں سلام کا دیوان کثیر فرمایا ہے۔

(فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز، ص ۱۱۷)

رجب علی بیگ سرور کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دیگر کاملین فن کے ساتھ ساتھ مرثیہ گو شعراء کا بھی ذکر ہے لیکن انیسؔ کا نام نہیں ہے۔ اس سے کسی حد تک ضرور تقدیم و تاخیر کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے یعنی فسانۂ عجائب کی تصنیف کے وقت (عہد نصیر الدین حیدر) دبیر کا شمار پختہ شعراء میں ہونے لگا تھا اور دلگیرؔ وغیرہ کے ساتھ ان کا ذکر بھی شامل ہے۔ اس وقت تک انیسؔ کی شاعری ابتدائی دور میں رہی ہوگی جس میں کوئی وزن و وقار نہیں پیدا ہو سکا ہوگا۔ بہر کیف یہ نتیجہ تو آسانی سے برآمد کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک انیسؔ نے یا تو مرثیہ گوئی شروع نہیں کی تھی یا ان کا کلام اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ دیگر کاملین فن کے ساتھ شمار کیا جائے۔

اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا دبیرؔ نے پہلے مرثیہ گوئی شروع کی تھی۔ اس اعتبار سے قریب المعنی مراثی کا قضیہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں کسی استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن اس فیصلے کے لئے یاران طریقت نے بڑی الٹ پھیر سے کام لیا ہے جس سے ان کی استدلال کی کاوشیں مسخرہ پن کی اچھی مثال بن جاتی ہیں۔ استدلال کیا جاتا رہا ہے کہ انیسؔ جا بجا اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے حریف ان کے مرثیوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ مثلاً

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
انیسؔ

ملتی نہیں دزدانِ معانی سے نجات
سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بختی ہے
انیسؔ

شکر خدا کر کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں
مرثئے میں موجد طرزِ جدید ہوں
انیسؔ

ایسے یا اس طرح سے اور دوسرے اشعار کے پیش نظر صاحب موازنہ نے استدلال کیا ہے کہ اس طرح کی چھوٹوں کو سن کر مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے ہیں یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔

شبلی نعمانی نے بساط قیاس وزن، ایسی شاخ نازک پر بچھائی ہے جس میں کوئی دم نہیں۔ اسی کے ساتھ موازنہ کرنے والے کا ایک طرفہ رخ بھی سامنے آجاتا ہے جب وہ دبیرؔ کے صرف دو شعر نقل کرتا ہے اور ایسے شعر جن میں طنطنہ نہیں بلکہ افہام و تفہیم کے پیش نظر اپنا دفاع پیش کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ دبیرؔ نے بھی انیسؔ کی طرح تیز شعر بھی کہے ہیں جو شرفِ قدامت رکھتے ہوں گے لیکن فاضل موازنہ نگار نے ان اشعار کو دانستہ نظر انداز کیا ہے۔ اس سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے سست کہ چست پر کلام اپنا ہے
لاریب خطاپوش امام اپنا ہے
جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں
ان مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے

یا

سرقہ مضمون کا زبوں ہوتا ہے
یعنی علم نظم نگوں ہوتا ہے
پر ان میں جو مندرج ہے حال شہدا
اس سے مرے مرثیوں کا خون ہوتا ہے

یا

شیران مضامین کو کہاں بند کروں
گونجیں گے ڈکاریں گے جہاں بند کروں
خلاقیٔ مضمون کا ہے دعویٰ سب کو
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں
جو مصرع موزوں مرا مشہور جہاں ہے
البتہ توارد ہو تو حیرت کا مکاں ہے
شاکر ہو دبیرؔ آل نبیؐ کی ہے یہ تائید
تازہ ہے تمامی سخن اور تازہ ہے تمہید
دزدان مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید
تو مجتہد نظم ہے فرض ان پہ ہے تقلید

یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار کلام دبیر میں ملتے ہیں جس سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مرزا دبیرؔ نے نہ صرف جواب دئے ہیں بلکہ انیسؔ کی طرح کے انداز بھی اپنائے ہیں۔

مندرجہ بالا رباعی میں دبیریت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے اور گزشتہ ادوار کے ناقدین کی سہل نگاری بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ پٹی پٹائی ڈگر کے سالکوں نے سہل پسندی کو راہنما بنا کر ایک ہی بات کو مختلف انداز سے دہرایا ہے۔ جس سے مسائل سلجھنے کے بجائے الجھتے رہے ہیں یا یوں کہہ دیا جائے کہ غلط روایت کی سند مختلف زبانوں میں جمہوری نظام کے تحت پیش کرتے رہے ہیں جس میں صداقت نام کو نہیں۔ دبیریت اور انیسیت کی افہام و تفہیم مغز سر کے اناس سے کم نہیں جس کے لئے ہمارے نام نہاد ناقدین اور محققین تیار نہیں۔ انیسؔ صدی تقریبات کے سلسلہ میں بھی کوئی ایسی تصنیف یا تالیف منظر عام پر نہ آسکی جسے اس صدی کا بیش بہا تحفہ قرار دیا جائے۔ اسی طرح دبیرؔ کے متعلق بھی کام کی رفتار سست رہی ہے۔ ایسے کام کی سخت ضرورت ہے جس میں انیسؔ اور دبیرؔ کی شخصیت اور فن کو مسلم الثبوت بنا کر پیش کیا جائے جو روایتی موازنے اور مناظرے سے بلند و بالا ہو کر فکر و فن کی تلاش کا کامیاب نمونہ ہو۔

❑❑❑

جدید مرثیہ کا پس منظر اور جوشؔ

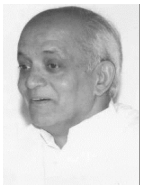

پروفیسر علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
موبائل: 9415306239

جوش کے مرثیوں کو جدید کہا گیا اور انقلابی بھی۔ رثائی ادب کے ماہر اور ممتاز مبصر جوش شناس ڈاکٹر ہلال نقوی نے ان کے تمام مرثیوں کو ترتیب دے کر 'جوش کے انقلابی مرثیے' کے عنوان سے شائع کیا۔ اپنے عمدہ مقدمہ میں جن چند مرثیہ نگاروں کو جدید مرثیہ کا امام کہا، ان میں جوش سرفہرست ہیں۔ جمیل مظہری، آل رجا، نسیم امروہوی وغیرہ کے نام بعد میں لئے گئے ہیں لیکن تحقیق وتنقید کی دیانت داری اور تلاش وتواتر کی رہگزاری بہرحال انیس اور عہد انیس سے رشتے استوار کرتی ہے۔ انیسویں صدی کا وسط، ۱۸۵۷ء کا انقلاب اور اس کے بعد سماجی، تہذیبی اور ادبی انقلاب انگیز تبدیلیاں جیسے اس عہد کے سنجیدہ، حساس شعراء ودانشور پوری سنجیدگی سے محسوس کر رہے تھے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے اثرات قبول کر رہے تھے۔ ممتاز ناقد احتشام حسین نے تین بڑے نقادوں حالی، شبلی اور آزاد کو پورے طور پر اس اثر میں پایا۔ مرثیہ نگاری کے تعلق سے بطور خاص لکھتے ہیں:

'اس دور کے تین اہم نقادوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ نویسوں سے متعلق اظہار خیال کر کے اس غلط فہمی کا پردہ چاک کیا کہ ان کا تعلق صرف مذہبی ادب کے محدود دائرے سے ہے۔'

(مضمون، موازنۂ انیس ودبیر)

تحقیق وتنقید کے حوالے سے باتیں اور کی جا سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا اثر شاعری پر زیادہ ہوتا ہے اور مرثیہ وجدید مرثیہ پر تو اس کا اثر پڑا ہی، ان اصناف پر بھی پڑ رہا تھا جو مرثیہ نہیں تھیں جیسے غزل اور نظم۔ چنانچہ غالب اور اقبال بھی شعوری یا لاشعوری طور پر مرثیہ کو جدید مرثیہ بنانے میں معاون ثابت ہو رہے تھے۔ یہ بات حیران کن ہوسکتی ہے کہ جدید مرثیہ پر غالب کے اثرات کس طرح سے ہو سکتے ہیں لیکن بس غور وفکر کی ضرورت ہے۔ پہلے ہلال نقوی کے یہ جملے ملاحظہ کیجئے:

'وہ انیسویں صدی کی ایسی آواز ہیں جس کی بازگشت اکیسویں صدی کی دہلیز تک پہنچ رہی ہے۔ انہوں نے کئی جہتوں سے پوری تاریخ ادب کو متاثر کیا۔'

(جوش کے انقلابی مرثیے، ص ۱۳۵)

غالب کی غیر معمولی طباعی، نادر خیالی اور سوالیہ و استفہامیہ انداز وغیرہ نے اس عہد کی پوری شاعری کو متاثر کیا اور فکر وخیال کے نئے نئے راستے کھولے۔ شاعری کے اس استفہامیہ رمزیہ انداز نے مرثیہ کو بھی متاثر کیا جس کے اثرات خود میر انیس کے یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ غزل میں غالب اور مرثیہ میں انیس صرف اپنی اپنی صنف تک محدود نہ رہ کر پوری شاعری، پورے ادب کو غیر معمولی طور پر متاثر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی جو شبلی سے اس لئے ناراض رہے کہ انہوں نے اپنے موازنہ میں غیر ضروری طور پر دبیر کو پیچھے کیا ہے۔ وہ بھی لکھتے ہیں:

'اس زمانے میں ذوق اور دبیر کو اولیت دئے بغیر ہم جو تاریخ اور اس کے ارتقاء کو زیادہ سے واضح طور پر دیکھ رہے ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ اہل میں غالب اور انیس ہی اس سارے دور کا حاصل ہیں۔'

(میر انیس اور مرزا غالب، ۱۹۷۲ء)

ایسا اس لئے تھا کہ یہ دونوں شعراء ساتھ ہی حالی، آزاد، شبلی وغیرہ اپنی اپنی انفرادی طباعی اور تخلیقی اپج وغیرہ کے ساتھ زمانے کی بدلتی ہوئی رفتار اور بدلتے ہوئے اقدار کو سمجھ رہے تھے۔ نئی تہذیب کی آمد آمد تھی۔ علم وفن بدل رہے تھے۔ روایتی تعلیم کی جگہ سائنس، فلسفہ اور مادہ کی تعلیم زور پکڑ رہی تھی۔ اس تبدیلی کو غالب اور انیس نے بھی سمجھ لیا تھا۔ غالب نے کچھ زیادہ ہر چند کہ دونوں ہی عظیم شعراء، مشرقی تہذیب کی معدومیت پر کف افسوس مل رہے تھے۔ ایک کشمکش تھی اور ایک کنفیوژن۔ غالبؔ کے ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

.....

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

انیس بھی کہہ رہے تھے:

کس وقت یہاں چھوڑ کے ملک عدم آئے
جب اٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے

انیس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ غزل کے بجائے

مرثیہ کے شاعر تھے اور ان کے عہد تک مرثیہ ضرورت سے زیادہ روایتی اور مشروط صنف بن چکا تھا۔ غالبؔ کے ساتھ بھی روایات تھیں لیکن غالب کی تیز نگاہی اور دور اندیشی اور ان کی پل پل کروٹ لیتی ہوئی ذہانت اور جبلت نے جو تجربے، اشارے اور فلسفے غزل میں دئے اس سے اردو کی غزلیہ شاعری کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ وہ مرثیہ کی طرف گئے بھی لیکن دو تین بند کہنے کے بعد انہیں احساس ہو گیا کہ وہ اس میدان میں انیس و دبیر سے آگے نہیں جا سکیں گے اس لئے انہوں نے مرثیہ نویسی کا خیال ترک کر دیا۔ قصیدے بھی مجبوراً یا ضرورتاً کہے۔ ان کی اصل دنیا غزل تھی جس میں پورے غالب تو نظر آتے ہیں انیسویں صدی کے تمام اتار چڑھاؤ اور بدلاؤ بھی نظر آتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان کی تیز نگاہوں نے ان صورتوں کو پڑھ لیا اور انہیں زمانہ اور زندگی کی ٹھوس حقیقت سمجھ کر قبول بھی کر لیا۔ ان کی یہ دور گامی تفہیم انہیں افسوس کم استقبال کرنے میں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک دن ہنگامی حالات پر یہ شعر کہتے ہیں:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

تو دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں:

آتش افروزی ایک شعلۂ ایماں تجھ سے
رونق افروزی صد شیر چراغاں مجھ سے

غالب کا ی ترقی پسندانہ اور دانش مندانہ مزاج صرف ان کی شاعری کو ہی نہیں بلکہ پوری اردو شاعری بلکہ شاعری کی تمام اصناف پر اثر کر گیا جس میں مرثیہ کی صنف بھی شامل ہے جس طرح غالب قدیم اور جدید غزل گوئی کا نقطۂ اتصال ہیں اسی طرح انیس بھی قدیم و جدید مرثیہ گوئی کا صنفی اور تہذیبی میل کا پتھر ہیں۔ اگر ایک طرف انیس پر مرثیہ نگاروں کے قدیم اثرات اور خاندانی روایات دیکھے جا سکتے ہیں تو ان کی بڑی شاعری اور بڑے ذہن اور وژن میں جدید مرثیوں کے آغاز کے آثار بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے جس سنجیدگی اور بالیدگی سے صنف مرثیہ کو برتا اور پھیلایا اور بگڑا شاعر مرثیہ گو کے سارے بھرم توڑ کر اسے عظیم شاعری کے تمام عناصر سے مالا مال کیا تو پھر انہیں اس بات کا حق پہنچتا ہے وہ کہیں:

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

اپنے انہیں حقیقی اور جدید رویوں کی وجہ سے ہلال نقوی یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

'اردو میں بہت کم مرثیہ گو شعراء ایسے ہیں جنہوں نے اس طرزِ فکر کے ساتھ شعوری طور پر مرثیہ میں انقلابی تبدیلیوں کے متعلق سوچا ہو'

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ص ۱۵۱)

یہاں شاد سے زیادہ ان انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اس لئے کہ یہ تبدیلیاں ہی جدید مرثیہ کی بنیاد ڈال رہی تھیں۔ خیال رہے کہ ۱۸۹۳ء میں حالی کا مقدمہ شائع ہو چکا تھا اور حالی کی یہ رائے سامنے آ چکی تھی۔

'گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنا اور شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہے'

اور بھی بہت کچھ حالی کے مقدمہ اور شبلی کے موازنہ میں تھا لیکن اس سے زیادہ زمانہ میں تھا جو کروٹ بدل رہا تھا۔ انیسویں صدی اپنے بے شمار شماجی اور اقداری تغیرات کے ساتھ بیسویں صدی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی اور صنف مرثیہ کی طرف نئے نئے در وا کر رہی تھی۔

ہلال نقوی نے جدید مرثیہ کے افادی پس منظر کے طور پر مرزا دبیر کے فرزند زاوجؔ کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا:

'بیسویں صدی کے ربع اول میں مرثیہ نگاروں کی حد تک شاد اور اوجؔ دو نام ایسے ہیں جن کی مرثیہ گوئی جدید مرثیے کے پس منظر میں قابل ذکر ہے۔ ان دونوں شعراء نے دو مرثیے کے سفر کی ایک ایسی منزل کہا جا سکتا ہے جہاں پہنچ کر قدیم مرثیہ گوئی کے قدم بھی تھک جاتے ہیں'

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں غالب کے بعد اقبال سب سے بڑے مفکر، شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔ یہ دونوں ہی شاعر بالخصوص اقبال مرثیے کے شاعر نہ تھے لیکن ان کی شاعری کی اساسی فکر اسلامیات سے گہرا رشتہ رکھتی تھی۔ کچھ لوگ انہیں اسلامی فکر کا ہی شاعر مانتے ہیں۔ علامہ کے اپنے افکار اور ان کی شاعری پر آفاقی آثار۔ قوم و ملت کے آزار اور سب سے بڑھ کر ہندو مسلم کی تکرار اور مسلمانوں کی جمودی رفتار نے اقبال کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا اور وہ بہت جلد وطنی اور مزاحیہ شاعری کا دامن چھوڑ کر شاعری کے اس وسیع و عریض دامن مین سما گئے جہاں فکر و فلسفہ، تاریخ و تہذیب، حیات و کائنات، ماضی و حال، جمال و جلال، شکوہ، جواب شکوہ، غرض کہ رسول، علی، حسین سے لے کر مارکس اور لینن وغیرہ سبھی ان کے دامن فکر میں سمٹ آئے اور شاعری پھیل گئی اور نظم اپنی بلندی پر پہنچ گئی۔ شاعری کا دامن بلند سے بلند تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

اقبال نے واقعۂ کربلا اور حضرت امام حسینؑ کے تجمیع کردار کو جس طرح اپنی شاعری دمیں فلسفۂ اسلامی اور جذبۂ قربانی کے ساتھ جذب کیا، وہ روایتی و قومی مرثیہ ہے۔ بالکل الگ ایک آواز جرس تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس آواز جرس میں بانگ دہل کم تھی، معرفت جدل زیادہ تھی۔ اقبال نے حسینؑ کے لافانی کردار میں جدال سے زیادہ جمال کو دیکھا اور حربے سے زیادہ سجدے کو دیکھا۔ ضرب سے زیادہ فقر کو دیکھا اور سجدۂ شبیری کو ضرب یداللہی کے قریب کر دیا اور یہ سب انہوں نے قرآن اور اسلام کے تناظر میں سمجھا اور

اور بے پناہ مصرعے گڑھے 'رمز قرآں از حسین آموختیم' یا 'حقیقت ابدی ہے مقام شبیری'

غرض کہ انیس، غالب، حالی، شاد، اقبال جوہر وغیرہ نے جدید مرثیہ کے لئے جو ماحول بنایا اس نے نئے مرثیہ نگاروں کو ایک نیا شعور تو دیا ہی، مرثیہ کو ایک جدید لہجہ بھی دیا۔ مرثیہ میں عوامی درد چھلکا۔ مزاحمتی لہر دوڑی اور وہ دبے پاؤں اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی زندگی سے وابستہ ہو گیا اور یہ روایتی احساس بھی دور ہو چلا کہ مرثیہ گوئی کی محض مذہبی شاعری ہے، محض گریہ و زاری ہے اور یہ ہونا ہی تھا اس لئے کہ وقت اور تبدیلئ وقت، زمانہ اور افتادِ زمانہ کے سفاک قدم جتنی تیزی سے انیسویں صدی کو روند رہے تھے، اتنی ہی تیزی سے بیسویں صدی کا سفر بھی طے کر رہے تھے۔ پھر اس سفر میں حادثات، تجربات کی ایک نئی دنیا بھی کروٹ لے رہی تھی۔ طاقت، مال و دولت اور صارفیت کے نئے نئے باب کھل رہے تھے۔ مزید تفصیل میں نہ جاتے ہوئے شارب ردولوی کے لمبے اقتباس کا تذکرہ کافی ہے:

بیسویں صدی یوں بھی بڑی انقلاب انگیز صدی تھی۔ اس نے بڑے بڑے کج کلاہوں کے سروں سے تاج اتار لئے۔ اس نے ایک طرف صنعتی زندگی کے ساتھ سیاسی انشاء دیا تو دوسری طرف سرمایہ و محبت کا ایک نیا تصور دیا۔ انسان اور انسان کے درمیان حائل، تنگ نظری اور سماجی نشیب و فراز کم کیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سائنسی انقلابات اور صافی کلچر نے فکری زاویں کو تبدیل کر دیا۔ ادبی سطح پر دوسری جنگ عظیم سے لے کر صدی کے غروب آفتاب تک اس نے فکر کے کئی دھارے دیکھے جس میں ادب کا زندگی سے تعلق اور زندگی کو بہتر اور زیادہ خوبصورت بنانے کے لئے اس کا استعمال ایک انقلاب انگیز فکری موڑ تھا جس نے پورے ادبی منظرنامے کو بدل دیا۔ سیاسی اور اقتصادی سطح پر تبدیلی ہوتی ہوئی زندگی نے صدیوں سے چلی آرہی شعری روایت کی بساط کو اگر پلٹ نہیں دیا تو اس کے اوپر ایسے سوالیہ نشان لگا دئے جنہوں نے وقت کی رفتار سے بے خبر شاعروں اور ادیبوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ رثائی ادب کی روایت پر بھی اس کا اثر پڑا۔ کلاسکیت کی گرفت اور تاریخ و عقائد کی مضبوط چہار دیواری بھی تبدیلیوں کو روک نہ سکی۔

نظم کے ضمن میں اقبال کے بعد جوش بلا شبہ بیسویں صدی کے سب سے اہم اور گونجتے ہوئے شاعر ہیں لیکن اس معنی خیز افادی گونج کو مخالفین جوش نے عام طور پر اور کبھی کبھی تو موافقین جوش نے بھی نعرہ بازی کی شاعری گھن گرج کی شاعری یا لفاظی کی شاعری کہتے آئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کچھ تو یہ غلط فہمی خود جوش کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب

.....

خواب کو جذبۂ بیدار دئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دئے دیتا ہوں

.....

جنگ جوئی ہے فطرت میری
آفریدی پٹھان ہوں پیارے

راقم الحروف بھی ان اشعار کو فنی اعتبار سے بڑی شاعری نہیں مانتا لیکن اس کی افادیت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ بہ عمیق نظر اور بے تعصب فکر دیکھنا یہ چاہئے کہ جوش کے نعرے اور بالخصوص جوش کے مرثئے اس جدید احساسات ولب ولہجہ اور شعور و ادراک میں کس قدر اضافے کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں مرثیہ کی روایات اور متغیر حالات پر نظر رکھنی ہوگی جس کا سرسری جائزہ پیش کیا جاچکا ہے۔

جوش نے باضابطہ ۹/مرثئے کہے ہیں۔ کچھ سلام اور پھٹکر چیزیں اور ہیں۔ بعض مرثیوں کو مرثیہ کم نظم زیادہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کے با قاعدہ عنوانات ہیں۔ کچھ یہ بھی کہ ان کا لہجہ تو مختلف ہے ہی ساتھ ہی وہ روایتی ہیئت میں نہ رہ کر اکثر نظمیہ انداز و لہجہ میں کہے گئے ہیں۔ جوش نے پہلا مرثیہ آوازۂ حق کے عنوان سے ۱۹۲۰ء میں رقم کیا۔ اس کے بعد حسین اور انقلاب (۱۹۴۱ء) موجد و مفکر (۱۹۵۷ء) اس کے بعد وقفہ وقفہ سے مرثئے کہے۔ یہاں سارے مرثیوں کا شمار مقصود ہے نہ تجزیہ۔ صرف وہ اشارئے اور تجزئے ہوں گے جس سے جوش کے مرثیوں کی آواز، انقلاب، پانی اور آگ کو سمجھا جاسکے۔ ان سب کے پس منظر اور پیش نظر منظر میں کیا ہے۔ وحدت انسانی، عظمت انسانی اور عظیم قربانی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جوش قطعاً اور عادتاً مذہبی آدمی نہ تھے بلکہ بعض لوگ تو انہیں ملحد وغیرہ بھی کہتے رہے ہیں لیکن آل رسولؐ سے بالعموم اور امام حسینؑ سے بالخصوص گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ہلال نقوی کی کتاب میں جوش کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند سطریں یوں ملتی ہیں:

ہم حسینؑ کے ماتم کی چھاؤں میں پلے مگر ان کے نقش قدم پر نہیں چلے۔ ہم اگر حسینیت کو اپنا لیں تو فلسفۂ باطل پاش پاش ہو کر رہ جائے۔ کوئی ایسا مائی کا لال نہیں ہے جو حسینؑ کی طرح میدان میں آئے اور اپنے خون میں نہائے اور دنیا کو لالہ زار بنا جائے۔

ان تحریروں میں ثواب کا جذبہ کم دنیا کو لالہ زار کرنے اور فلسفۂ باطل کو پاش کرنے کا جو حوصلہ اور ولولہ زیادہ ملتا ہے یعنی حسینیت کی اصطلاح انسانیت اور شجاعت اور زندگی کی عظمت سے مرکب ہے جس سے عالم انسانیت کھل اٹھے اور دنیا لالہ زار ہو اٹھے۔ یہی ان کے نظم نما مرثیوں کا تیور ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ان کا طرزِ حیات ہی ان کی شاعری ہے اور ان کی شاعری ہی طرزِ حیات۔ راقم نے ان کے مرثیوں کو نظم

نما اسی لئے کہا ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنی نظموں میں جو وسعت اور انقلابیت دی ہے ان کے مرثئے بھی اس سے الگ نہیں ہیں۔ بقول ہلال نقوی:

'ان کے مرثئے بھی اسی وسیع الموضوعات عظیم تر نظم نگاری کا حصہ ہیں اور ان کی نظمیں فطرت، انسانیت، حریت اور انقلابیت سے پر ہیں۔ مرثیہ نگاری بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ انقلابیت لفظ پر میں زور دینا چاہتا ہوں کہ ہلال نقوی نے بھی ان کے مرثیوں کو انقلابی مرثئے کہا ہے اور خود جوش دوسرے مرثیہ کا عنوان ہی رکھتے ہیں 'حسین اور انقلاب' (۱۹۴۱ء)'

خیال رہے کہ یہ مرثیہ ۱۹۴۱ء میں کہا گیا جب تحریک آزادئ ہند شباب پر تھی اور جوش کی شخصیت اور شاعری پر بھی شباب چھایا ہوا تھا۔ بقول پروفیسر سید محمد عقیل:

'جوش کے حسین اور انقلاب کے ساتھ مرثیہ کے سماجی تاو پود میں اس وقت کے ہندوستان میں ہونے والے انقلاب کی دھمک سنائی دیتی ہے۔ اس کے ہلکے ہلکے اشارے جوش آوازۂ حق (۱۹۲۰ء) میں کر چکے تھے مگر حسین اور انقلاب میں احتجاج اور انقلاب کی صورت بہت واضح ہے۔'

(جوش کی مرثیہ نگاری پر کچھ باتیں، جوش شناسی، ص ۳۹)

اب آپ اس مرثیہ کے چند بند ملاحظہ کیجئے:

ہوتا ہے جو سماج میں جو پائے انقلاب
ملتا ہے اس کو مرتد و زندیق کا خطاب
پہلے تو اس کو آنکھ دکھاتے ہیں شیخ و شاب
اس پر بھی وہ نہ چپ ہو تو پھر قوم کا عتاب
بڑھتا ہے ظلم و جور کے تیور لئے ہوئے
تشنیع و طعن و دشنہ و خنجر لئے ہوئے

متعدد بند ہیں جس میں حضرت امام حسینؑ کی شجاعت اور ایثار پر جسے بار بار دہرایا گیا ہے لیکن اس کے انقلاب وقت پر گفتگو کم کی گئی ہے لیکن جوش اکیلے شاعر ہیں جو حال کو ماضی سے جوڑتے ہیں اور ماضی کی کربلا کی جنگ کو حال سے جوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں:

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہر یار
پھر کربلائے نو سے ہے نوع بشر دوچار
اے زندگی جلال شہ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسینؑ دے
پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو
سرمایہ پھر ہے بر سر آزار دوستو
تا کئے یہ خوف اندک و بسیار دوستو
تلوار ہاں اپی ہوئی تلوار دوستو
جو تیز تر ہو خون امارت کو چاٹ کر
رکھ دے جو سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ کر

یہ جو گرمئ تخلیق ہے اور حدّت فکر ہے وہ جوش کو نہ صرف روایتی مرثیہ گوئی سے الگ کرتی ہے ساتھ ہی اس عہد کی مجہول تہذیب، روش اور بود و باش سے بھی الگ کرتی ہے نیز مرثیہ کو مجلسی صورتوں سے نکال کر تحریکی انداز عطا کرتی ہے۔ جوش سے قبل اور عہد جوش میں بھی مرثیہ نگاری، انفرادی، ثوابی اور فنی صورتوں سے زیادہ دوچار تھا۔ جوش نے اسے سماجی صورتوں سے جوڑا جسے وقتی طور پر بہ آسانی نہیں لیا گیا لیکن انسانی اور عمرانی زوال اور سنگین مسائل سے دیر تک اور دور تک چشم پوشی بھی نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ سماجی مسائل ہر دور میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں کہ سماج کبھی کبھی فکر و خیال، تہذیب و ثقافت کے تضاد و تصادمات کے چوراہے پر آ کھڑا ہو جاتا ہے لیکن عظمت انسانی اور عظیم قربانی ایسے عبوری دور کو بھی فتح پانے کی طاقت رکھتی ہے بشرطیکہ اس کی فطرت اور جستجو صحیح راہ پر گامزن ہو۔ جوش انسان کی اس فطرت سے بھی معرفت رکھتے ہیں اور فسانۂ آہ و فغاں اور غم ایں و آں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اس مرثیہ کے ابتدائی بندوں میں انسان اور کائنات کے تلخ و شیریں تجربات پر مرثیہ کا آغاز کرتے ہیں اور چوتھے ہی بند میں وہ انسانی عظمت اور اس کی تعمیری فطرت پر کیا معرکے کا بند کہتے ہیں۔

بیگانۂ حدود ہے انساں کی آرزو
پیچیدہ ہر نظر میں ہے اک تازہ جستجو
تھمتی نہیں کہیں بھی تمنائے برق خو
ساقی کا وہ کرم ہے کہ بھرتا نہیں سبو
ارماں کی شاہراہ میں منزل نہیں کوئی
اس بحر بے کنار کا ساحل نہیں کوئی

کچھ اور بے مثال بند ہیں جو روایتی مرثیوں کی حدیں توڑتے نظر آتے ہیں لیکن بات صرف حد شکنی تک محدود نہیں بلکہ زندگی کا وہ اجتماعی تصور اور افتاد حیات۔ مذاق و مزاج، امیدیں و آرزوئیں ان سب کے مابین انسان کے کرشمات۔ مرثیہ کی صنف جو مدتوں واقعۂ کربلا کے حوالے سے گریہ وزاری، عقیدت مندی اور قادر الکلامی تک محدود تھی، پہلے اقبال، شاد وغیرہ نے اور بعد میں جوش نے فکری اور انسانی سطح پر پھیلا دیا۔ جوش کی نظر میں امام حسینؑ سے بڑا انسان کون تھا۔ ان کی شجاعت بے مثال، ان کا صبر و استقلال بے مثال اور ان کی قربانی بے مثال تبھی تو مرثیہ 'موجد و مفکر' میں بے ساختہ کہتے ہیں:

کر دیا تو نے یہ ثابت اے دلاور آدمی
زندگی کیا موت سے لیتا ہے ٹکر آدمی
کاٹ سکتا ہے رگِ گردن سے خنجر آدمی
لشکروں کو روند سکتے ہیں بہتّر آدمی
ضعف ڈھا سکتا ہے قصر افسر و اورنگ کو
آبگینے توڑ سکتے ہیں حصارِ سنگ کو

عین ممکن ہے کہ اس وقت یہ مرثئے نہ پسند کئے گئے ہوں لیکن فکر جوش اور جولانئ جوش نے کبھی اس کی نہ پروا کی اور نہ ہی معذرت۔ فیض نے زندگی میں

صرف ایک مرثیہ کہا اور وضاحت کے طور پر لکھا، فرمائش پر۔لیکن وضاحت اور معذرت کے الفاظ جوش کی لغت میں تھے ہی نہیں۔اچھی بات یہ تھی کہ پوری دنیا کا بالعموم اور ہندوستان کا بالخصوص بدلتا ہوا سماج اور زندگی تو انجانے طور پر ساتھ تھی یا جوش کے مرثئے اس عہد کی زمانی اور زمینی قدروں کے ساتھ تھے۔

جوش کی بلندیٔ فکر اور کمال فن کا اہل کارنامہ یہی ہے کہ اس نے مرثیہ جیسی روایتی اور مذہبی صنف میں حریت فکر اور ترقی پسند شعور کی بنیاد ڈالی اور پھر یہی عناصر آگے چل کر جدید مرثیہ کا طور اور آہنگ بن گیا۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ پوری شاعری بالخصوص مرثیہ نگاری میں جذبات کی جگہ عقل نے لی۔ رقت کی جگہ ہمت نے لی، ماضی کی جگہ حال نے لی۔پہلی بار ایسا ہوا وہ بھی جوش کی شاعری کے ذریعہ بطور خاص کہ عام سامعین کربلا کی جنگ سے رشتہ جوڑتے ہوئے آزادی کی جنگ کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئے۔پہلی بار خوابیدہ ذہنوں نے بیداری کی گرمی محسوس کی، انہیں سیاسی اور سماجی مسائل کا علم ہی نہیں اثر بھی ہوا اور ایک خیال کے مطابق حضرت زینبؑ کے کردار کی تقلید میں حضرت محل کا کردار منقلب ہوا۔ یہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن یہ تو ہوا ہی کہ اودھ کی ریاست اور شیعی تہذیب کی نزاکت وعیش وعشرت نے ظلم واستحصال کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور جو نازک وقت ان پر آپڑا تھا اور وہ جس سے بے خبر تھے اور بے خبر بنے رہنا چاہتے تھے جوش کی شاعری نے خاص طور پر رثائی شاعری نے انہیں بیدار اور باخبر کیا اور بتلایا کہ واقعۂ کربلا صرف اسلام کا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک انسان کا حادثہ ہے اور مکمل عالم انسانیت کا المیہ ہے۔ جوش نے مرثیہ کو ایک مخصوص سبق سے نکال کر ایک بڑے سیاق وسباق میں پیش کیا اور اسے ایک بڑا تناظر دیا اور کہا:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

فنی اعتبار سے بھی ان مرثیوں میں زبان و بیان، تصور وتخیل کی جو بلندیاں پیدا ہوئیں وہ پہلے کم تھیں۔ منظر نگاری، کرداری نگاری، جذبات نگاری وغیرہ پر زور دیا تھا اس کی بھی اپنی غیر معمولی اہمیت ہے لیکن جوش نے جدید مرثیوں میں تصورات کو بلندی عطا کی وہ قابل غور ہے اور اضافے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے خیال میں ایسا اس لئے بھی ہوا کہ جوش پورے طور پر روایتی مذہبیت اور رسمی عقیدت کے راستے سے مرثیہ نگاری کی طرف نہیں آئے تے ھے۔ ان کی فطری حریت فکر، انسان دوستی اور عقل پرستی انہیں مرثیہ کی طرف لے کر آئی۔ اس لئے ان میں روایتی گرویہ و زاری، اجزائے مرثیہ کی پابندی وغیرہ نہیں ملتی۔ ان کے بیشتر مرثیوں کے مزکر میں صرف امام حسینؑ ہیں اور ان کا لازوال اور بے مثال کردار کردار۔ جوش نے اپنی غیر معمولی تخلیقی اپج اور نظمیہ و انقلابیہ کیفیت وذہنیت کے ساتھ اس عظیم کردار اور اس عظم حادثہ کو پیش کیا اس لئے اس میں نہ روایتی مرثیہ کا بیانیہ ہے اور نہ گریہ۔ بہرحال ان تبدیلیوں کے ساتھ ان کے مقاصد عظیم اور کربلا کا عظیم پیغام اور امام حسینؑ کا لازوال کردار بھی۔ان تینوں صورتوں، موجودہ صورتوں اور انسانی جبلتوں غرض کہ نئے احساسات وشعور کے ساتھ ساتھ جوش نے یہ مرثیہ ایک بڑے سماجی اور سیاسی مقصد کے لئے کہے جس میں وہ مقاصد بھی بہرحال شامل رہے ہیں جن کے لئے مرثیہ کہے جاتے رہے ہیں۔قدیم ذہن کے کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جوش کے مرثیوں میں گریہ وبکا نہیں ہے جس کے جواب میں بار بار جوش نے کہا:

'پہلے جو مرثئے کہے جاتے تھے وہ صرف بکا کے لئے کہے جاتے تھے۔ مآل مجلس ہچکیوں پر ختم ہوتا تھا اور اب جدید یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہمت تازہ کریں اور باطل سے لڑنے کا ولولہ پیدا کریں۔'

(بحوالہ جوش کے انقلابی مرثئے، ۳۰۸)

اور یہ بھی کہتے ہیں:

'مرثیہ گوئی کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے کہ بکا پر تان ٹوٹے، لکھتے وقت کوئی مصرعہ یا بند وقت قلب کا آجائے تو وہ اور بات ہے لیکن اس کی نیت یہ نہ ہو کہ رلا کر اٹھائے بلکہ جھنجھوڑ کر اٹھائے۔'

(بحوالہ جوش کے انقلابی مرثئے، ۳۰۸)

ممتاز ناقد وادیب پروفیسر وہاب اشرفی کے ان خیالات پر گفتگو تمام کرتا ہوں:

'جوش کی شخصیت بیحد منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے جنہوں نے رسمیات سے گریز کیا ہ۔عمومی طور پر مرثیوں کے جو کلاسیکی تقاضے ہیں، ان سے الگ تھلک رہنے کی سعی پیہم کی ہے۔مرثئے کی روایات میں جو ماورائیت اور روحانی اوصاف کی نمائندگی کی جاتی رہی ہے اس سے گریز نیز عقیدے کے چہار دیواری میں رہنے کے باوجود ان سے نکلنے کے لئے حضرت امام حسینؑ کو نئے تقاضوں کے تحت دیکھتے اور انقلابی اور استحصال کے خلاف جنگ کرنے والے ایک لافانی پیکر کے جو مظاہر سامنے لائے وہ ان کے لئے اپنے فکری میلان اور حضرت حسینؑ کے باب میں یا پورے کربلا کے سلسلہ میں قطعی ایک نئے نقطۂ نظر کی تشکیل کی راہ ابھاری....

..... جوش ملیح آبادی انیس و دبیر کی فنکاری سے ہم رشتگی کے باوجود مرثیوں کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ واقعات کربلا کو نئے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور متعلقہ کرداروں کو زمینی بنا کر انقلاب کی راہ ہموار کرتے ہیں۔استحصال اور انسانی پستی کے سامنے بعض آئیڈیل کردار کے تفاعل سے نئے امکانات ومضمرات پیدا کرتے ہیں جو صرف جوش ملیح آبادی کا ہی حصہ ہے۔'

(مراثی جوش کی عصری معنویت)

❑❑❑

بیانیہ اور انیسؔ

مخصوص مرثیے کا تجزیہ

اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ

پروفیسر نیر جلالپوری
صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی
موبائل: 9919785172

اچھی کہانی، بری کہانی، بڑی کہانی، چھوٹی کہانی، کہانی بہرحال کہانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کہانی کہنے کا فن بری کہانیوں کو اچھی کہانیوں میں بدل دیتا ہے، چھوٹی کہانیوں کو بڑی کہانی بنا دیتا ہے اور کبھی کہانی کہنے کے فن کی کوتاہی کے نتیجے میں اچھی کہانیاں بھی انسانی فکر کو متاثر کرنے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ یہ کہانی کہنے کا فن ہی ہے۔ جو فرضی واقعات کو تاریخی واقعیت کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تاریخی واقعیت کہانی کہنے کے فن کے فقدان کے سبب داستان گم گشتہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہانی کو اگر تاریخی صداقت کا سہارا مل جائے تو جہاں کہانی کی معنویت اور اثر انگیزی ہزاروں گنا بڑھ جاتی ہے وہیں کہانی کہنے والے کی اپنی ذمہ داریوں میں بھی ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ تاریخی کہانی کو پر پھیلانے کے لئے آسمان تخیل کی وہ وسعتیں حاصل ہوتی ہیں اور نہ وہ اذن پرواز جو ایک فرضی کہانی کو فطری طور پر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود تاریخی کہانی کو بھی کہانی کہنے کے ایک ایسے کمال فن کی ضرورت ہے جو اس کی تاریخی واقعیت کو کسی تخیلاتی مفروضے کے سہاروں سے مستحکم نہ کرے چونکہ اس میں خود تاریخی صداقتوں کے مجروح ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ تاریخی واقعے کو بیان کرتے وقت کہانی کار کی اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے تخیل کے بازوؤں کو حقیقت کی دنیاؤں سے پرے پر پھیلانے کی کوشش نہ کرے اور اس کے باوجود کہانی کہنے کے فن کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کر دے ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ کہانی کار کی تخئیل نے کہانی کی تاریخی واقعیت کو مجروح نہ کیا ہو۔ کیوں کہ تخئیل واقعے سے ماورا شے ہے۔ لیکن جن تاریخی واقعات میں کہانی بننے کی صلاحیت ہے ان واقعات میں جہاں جہاں تاریخ خاموش ہے وہاں وہاں تخئیل مناظر اور مکالمے پیدا کر دیتی ہے کہانی کہنے والے کا بنیادی فن یہی ہے کہ وہ تاریخ کی بین السطور خاموشی کو منظر اور مکالمے میں ڈھالتے وقت جو کچھ تخلیق کرے وہ اس واقعے کے مزاج، کیفیت اور محل کے خلاف نہ ہو۔ گویا قاری یا سامع کو یہ لگے کہ بے شک تاریخ میں اس منظر یا مکالمے کا تذکرہ بھلے ہی نہ ہوا ہو لیکن اگر یہ منظر اس واقعے میں پیدا ہوا ہوتا تو یقیناً یہی مکالمہ ہوتا۔ تب تاریخ کی بین السطور خاموشی کو لفظوں کا لبادہ دینے والا فنکار مورخ کی مشاہدہ کرنے والی آنکھ بن جاتا ہے یعنی قاری یا سامع یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ منظر اور یہ مکالمے سب کچھ واقعے میں موجود تھے۔ لیکن مورخ نے بہ احتیاط اختصار اس کو قلم بند نہیں کیا۔

اردو کے بہت سے مرثیہ نگاروں نے کربلا کی تاریخ کو اسی قدر خوبصورتی کے ساتھ کہانی بنا کر عوام تک پہنچایا ہے۔ حالانکہ مرثیہ نگاروں کی کہانی نے کہیں کہیں تاریخ سے تجاوز کیا ہے لیکن کہانی کو محض تخئیل یا مفروضات کے حوالے بھی نہیں کیا ہے۔

اردو مرثیے میں اگر کہیں تاریخ سے تجاوز کی کوئی مثال نظر آتی ہے تو اسے بھی کسی نہ کسی روایت کا سہارا ضرور حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس روایت کے تاریخی استناد پر بحث کی گنجائش موجود ہو۔ لیکن ایسی ساری روایتوں کا رشتہ ایک ایسی مستحکم واقعیت سے جڑا ہوا ہے۔ جو انہیں تاریخی استحکام بخش دیتی ہے۔ یوں بھی مرثیہ نگاروں کی کہانی کا موضوع چند ایک جہتوں میں ہی پرواز کی اجازت دیتا ہے کربلا کی کہانی خود اپنے اندر اتنے تنوع اور اتار چڑھاؤ رکھتی ہے کہ اس کے لئے کسی مفروضے کا سہارا لینے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ ایک کہانی کے جو لازمی عناصر ہوتے ہیں وہ سب کربلا کے تاریخی سانحے میں موجود ہیں جہاں ایک طرف عشق، عرفان اور آگہی ہے تو دوسری طرف ظلم، وحشت اور بربریت۔ ادھر محبت ایثار اور جانثاری ہے تو ادھر مکر، فریب اور عیاری۔ گویا ایک کامیاب کہانی کے سارے تلازمات کربلا کے تاریخی واقعے سے بہ آسانی فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ کہانی کی دنیا میں عظیم ترین شاہکار غم انجام واقع ہوئے ہیں چنانچہ کربلا کی کہانی ایک ایسا رزمیہ ہے جس کا اختتام غم بلکہ انتہائے غم پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی کربلا کا تاریخی واقعہ کہانی کا ایک شاہکار ہے۔ مرثیے نے اپنی شعری نزاکتوں اور فنی لطافتوں سے اس حزنیہ کہانی کی درد انگیزیوں کو انسانی فطرت کے عین مطابق اور انسانی فکر کے حد درجہ قریب کر دیا ہے۔ اس طرح مرثیے نے کربلا کی کہانی کو ایک عام آدمی تک پہنچانے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

کہانی کہنے کا فن یوں تو ہر اچھے مرثیہ نگار کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن میر انیسؔ نے کہانی کہنے کے فن کو اعتبار و عظمت کی جن اونچائیوں تک پہنچا دیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ انیسؔ اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کی بنا پر تمام

مرثیہ نگاروں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ قدرت کے عطا کردہ بیانیہ کے اس فن نے جہاں انیسؔ کی وقعت وعظمت میں اضافہ کیا وہیں انیسؔ کی باریک بینی، فطری جذبات اور نفسیات کی عکاسی نے بیانیہ کے فن کی عظمتوں میں بھی اضافہ کیا۔ انیسؔ کا تخیل واقعے کے پس منظر میں چھپی ہوئی ان جزئیات کو بھی تلاش کر لیتا ہے جو بیانیے میں شامل ہو کر کہانی کا لازمی عنصر نظر آنے لگتی ہیں اور واقعے کے نفسیاتی ماحول کی تشریح کرنے لگتی ہیں۔ کہانی اور بیانیہ کے حوالے سے جائزہ لینے کے لیے یہاں ہم نے انیسؔ کے مشہور مرثیے کا انتخاب کیا ہے۔

'اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ'

یہ مرثیہ زوجۂ امام حسینؑ حضرت شہر بانوؑ اور خود امام حسینؑ کی خلوت کے ایک لطیف ترین لمحے سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت شہر بانو شہنشاہ ایران یزدجرد کی بیٹی اور امام زین العابدینؑ کی والدہ ہیں۔ ایک عصمت مآب خلوت کا تمام تر تقدس انیسؔ کی نگاہ میں ہے۔ زوجین کے درمیان ہونے والی گفتگو کو انیسؔ نے اپنی عقیدت واحترام کے باوجود عام انسانی سماج سے حددرجہ نزدیک اور فطری کر دیا ہے۔ امام حسینؑ حضرت شہر بانو کی کنیز شیریں کی آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں۔ چونکہ حضرت شہر بانو معصوم نہیں ہیں اس لئے انہیں یہ گمان گذرتا ہے کہ شاید امام حسینؑ کو یہ کنیز پسند خاطر ہو۔ ایک وفا شعار اور اطاعت گذار بیوی فطرت کے عین مطابق اپنی کنیز کو سجا سنوار کے امام حسینؑ کی کنیزی کے لئے پیش کرتی ہیں۔ اپنی خواہشات نفسانی کو رضائے الٰہی کی خاطر بیع کرنے والا معصوم امام کسی کنیز کی آنکھوں کی تعریف اس مقصد سے کر بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن امام حسینؑ جناب شہر بانو کے گمان کو اپنی وسیع القلبی اور عفوودرگذر کی عادت سے لے کر کنیزی میں قبول کر کے انعام واکرام دے کر آزاد کر دیتے ہیں۔ وہ کنیز جسے اس گھرانے کی خدمت کرتے کرتے گھر کے ایک ایک فرد سے عشق ہو چکا ہو اسے جدائی شاق تو ہے لیکن حکم امام سے مجبور ہو کر ڈیوڑھی سے رخصت ہوتے وقت ہر فرد سے وعدہ لیتی ہے کہ وہ اسے اپنے غم اور خوشی سے دور نہ رکھے۔ ہر موقعے پر اسے یاد کرے اور کسی دن اس کے یہاں مہمان ہونا قبول فرمائے۔ امام حسینؑ وعدہ فرما لیتے ہیں لیکن یہ وعدہ بڑے عجیب انداز میں ایفا ہوتا ہے یعنی امام حسینؑ کی شہادت کے بعد شام کا لشکر حسینؑ کا سر بریدہ نیزے پر رکھ کر جب دمشق کے لئے روانہ ہوتا ہے تو راستے میں وہ قریہ بھی پڑتا ہے جہاں شیریں آزادی کے بعد اپنی خانگی زندگی گذارنے لگتی ہے۔ حسینؑ کا بریدہ سر اور حسینؑ کے تمام رسن بستہ حرم ایک شب شیریں کے یہاں مہمان ہوتے ہیں۔ مگر کیسے؟ یہی اس کہانی کا حسن اور کلائمکس ہے۔

اس کہانی میں انیسؔ نے اپنی فنکارانہ چابک دستی سے پورے بیانیے کو اتنا فطری اور بے ساختہ بنا دیا ہے کہ قاری یا سامع کے ذہن کو کسی تاریخی استدلال کی حاجت نہیں رہ جاتی۔ کہانی کا آغاز شیریں کی آنکھوں کے حسن کی تعریف سے ہوتا ہے اور کہانی کے اختتام میں شیریں قدرت سے شکوہ کرتی نظر آتی ہے کہ کیا اسی اندوہ ناک منظر کو دیکھنے کے لئے میری آنکھیں سلامت ہیں۔ کیوں! ہے ناں انیسؔ کو کہانی اور بیانیہ کے فن پر پوری قدرت! ۸۸/ بندوں پر مشتمل انیسؔ کا یہ مرثیہ امام حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ انیسؔ نے امام حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کی دلیل میں حسین اور خدا کے درمیان ہونے والے اس وعدۂ طفلی کا حوالہ پیش کیا ہے جو امام حسینؑ نے عصر عاشور سجدے میں سر قلم کرا کے وفا کیا:

اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ
دریائے وفا کے درشہوار تھے شبیرؑ
خوشنودیٔ خالق کے طلبگار تھے شبیرؑ
اقلیم صداقت کے جہاں دار تھے شبیرؑ
چاہا جو خدا نے وہی چاہا شہ دیں نے
کیا وعدۂ طفلی کو نباہا شہ دیں نے

مرثیے کے ابتدائی چار بند اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ انیسؔ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کسی شاعرانہ مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ تاریخی واقعیت کو دلیل بنا کر امام حسینؑ کے مزاج ایفائے عہد کو ظاہر کیا ہے۔ مثلاً تیسرے بند کی بیت دیکھئے ؎

وعدہ فقط اک سر کا تھا درگاہِ خدا میں
حضرت نے بہتر دیئے سر راہِ خدا میں

یا پھر چوتھے بند کی بیت:

اس طرح کے صادق کبھی دیکھے ہیں کسی نے
مرکر کیا وعدے کو وفا سبط نبیؐ نے

پانچویں بند سے انیسؔ نے کہانی کا آغاز کیا ہے۔ منظر امام حسینؑ اور ان کی زوجہ حضرت شہر بانو کی خلوت کا ہے۔ جہاں بقول انیسؔ:

بانو سے جو مانوس شہنشاہ زمن تھے
کچھ پیار کی باتیں تھیں محبت کے سخن تھے

کہانی کی دلکشی ابتدا سے ہی قائم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس گفتگوئے محبت میں امام حسینؑ کی نگاہ حضرت شہر بانو کی کنیز خاص شیریں کی خوبصورت آنکھوں پر پہنچ جاتی ہے۔ دیکھئے انیسؔ اس لطیف منظر کو کس قدر فطری انداز میں پیش کرتے ہیں:

شیریں پہ جو حضرت کی نظر جا پڑی اک بار
بانو سے یہ بولے بہ تبسم شہ ابرار
خوش چشم ہے کس مرتبہ شیرین خوش اطوار
اس طرح کی آنکھیں کبھی دیکھی نہیں زنہار
فرمائی جو یہ بات شہنشاہ امم نے
نیوڑھا لیا سر دختر سلطان عجم نے

مرثیے کے اگلے پانچ بند ایک محبت گذار اور وفا شعار بیوی کی نفسیات کا بیانیہ ہیں۔ جہاں ایک خاتون شوہر کی خوشنودی کی خاطر اپنی کنیز کو اپنے سے زیادہ محترم اور صاحب جاہ کہتی ہے۔ صرف اس لئے کہ اس ذی جاہ شوہر کی نگاہ پسند نے اسے منتخب کر لیا ہے۔

حالانکہ یہ عام عورتوں کی فطرت سے بہت بعید ہے لیکن جو خاتون امام حسینؑ جیسی عظیم شخصیت کی زوجیت میں ہو، اپنے شوہر کے لئے اس کا یہ جذبۂ اطاعت قطعی غیر مانوس معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ حضرت شہر بانو کے کوائف وحالات سے آگاہ لوگوں کے لئے یہی بات عین مطابق فطرت معلوم ہوتی ہے۔

یہیں سے انیسؔ اپنے قاری کو نہ صرف یہ کہ حضرت شہر بانو کی شخصیت اورمزاج سے متعارف کراتے ہیں بلکہ پورے خانوادۂ عصمت کے ماحول سے نہایت مختصر الفاظ اور انتہائے قدرت فن کے ساتھ روشناس کرادیتے ہیں۔ دیکھئے کہانی کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ شہر بانو شیریں کو اشارے سے بلاتی ہیں۔ ایک حجرے میں لے جاتی ہیں۔ اسے خوبصورت پوشاک پہناتی ہیں۔ گیسوؤں میں شانہ کرتی ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں۔ یہ سب ہوتے ہوئے دیکھ کر بچپن سے شہر بانو کی تربیت میں رہنے والی کنیز اپنی ملکہ سے بصد استعجاب ماجرہ پوچھتی ہے۔ ملکہ بہ ہزار افتخار آج خود کو کنیز کی لونڈی بتاتی ہے۔ شیریں کو موتی ہیروں سے آراستہ کرلینے کے بعد شہر بانو امام حسینؑ کو حجرے میں بلاتی ہیں۔ امام حسینؑ کو احساس ہوتا ہے کہ شاید شہر بانو میری باتوں سے آزردہ ہوں۔ چنانچہ انیسؔ اس مقام پر امام حسینؑ کی زبان سے یہ مکالمہ ادا کرتے ہیں:

جو سمجھی ہو تم اس کا مجھے دھیان نہیں ہے
جب تم سی ہو بی بی تو کچھ ارمان نہیں ہے

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ امام حسینؑ اپنی اطاعت شعار بیوی کے نذرانے کو قبول کرتے ہی، آزاد کردیتے ہیں اور اس طرح اپنی زوجہ کو زیان وقار واحترام کی بدگمانی سے بھی آزاد کردیتے ہیں۔ ؎

تم نے دیا ہم کو یہ صادق ہو وفا میں
ہم نے اسے آزاد کیا راہ خدا میں

حکم امام پاکر شہر بانو اپنی کنیز کو کثیر زر ومال اور انعام واکرام کے ساتھ آزاد کرتی ہیں۔ امام حسینؑ شہر بانو سے آج اس خاص انداز سے مائل بہ کرم ہونے کا سبب پوچھتے ہیں۔ منظر مزید التفات کا مظہر ہوجاتا ہے۔

بانو نے سنی جب شہ والا کی یہ گفتار
خوش ہوکے پھری گرد محبت سے کئی بار
اور اس کو دیا زیوروزر، درہم ودینار
حضرت نے کہا اس کا سبب کیا مری غم خوار
اوروں کو نہ اتنا زروزیور دیا تم نے
شیریں سے یہ الفت کہ غنی کردیا تم نے

اگلا بند امام حسینؑ کے سوال کی وضاحت کرتا ہے اور اسی بند کو انیسؔ خانوادۂ عصمت وطہارت کی عظمتوں کے اظہار کا زینہ بنادیتے ہیں۔ ؎

بانو نے کہا ان سے ہو کیوں کر یہ برابر
آزاد کیا تھا انہیں میں نے مرے سرور
ہرچند کہ سلطان عجم کی ہوں میں دختر
پر فاطمہ زہراؑ کی کنیزوں سے ہوں کمتر
خود صدقے ہوں شیریں پہ اگر میں تو بجا ہے
فرزند نبیؐ نے اسے آزاد کیا ہے

یہاں کہانی میں ایک اہم موڑ آتا ہے۔ کہانی ہجر کے مناظر میں داخل ہونے لگتی ہے۔ یہیں پر انیسؔ کہانی میں آگے چل کر کام آنے والے بعض اہم کرداروں کو اپنے قاری سے بیک وقت متعارف کرادیتے ہیں۔ مثلاً سید سجادؑ اور جناب زینبؑ کے کردار۔ ان کرداروں کے تعارف میں شیریں کی ان سے والہانہ عقیدتیں بھی واضح ہوجاتی ہیں۔ انیسؔ نے نہایت ذہانت کے ساتھ کہانی میں آنے والے پیچ وخم کے لئے ماحول کی تشکیل یہیں سے کردی ہے۔ اپنی رہائی کی خبر پاکر شیریں حزن وملال اور ہجر ومفارقت کی کیفیتوں سے اس طرح دوچار ہوتی ہے۔ ؎

شیریں کے یہ سن کر ہوئے اشک آنکھوں سے جاری
لیں ہاتھوں سے بانو کی بلائیں کئی باری
سجادؑ کو لے گود میں بولی کی میں واری
اب تم سے جدا ہوتی ہے یہ لونڈی تمہاری
خط بھیج کے اپنا مرا دل شاد کروگے
اس پالنے والی کو بھی کیا یاد کروگے

پھر پاؤں پہ سر حضرت زینبؑ کے جھکایا
شفقت سے گلے شاہ کی خواہر نے لگایا
جب آپ کو اس نے قدم شہ پہ گرایا
سب روتے تھے حضرت کو بھی رونا بہت آیا
مولا کے نہ قدموں سے جدا ہوتی تھی شریں
نعلین سے منھ ملتی تھی اور روتی تھی شیریں

کہانی کی حزنیہ فضا قائم ہوچکی ہے۔ شیریں امام حسینؑ سے مع اہل حرم اپنے یہاں کسی نہ کسی روز مہمان ہونے کی درخواست کرتی ہے۔ امام حسینؑ کنیز کی درخواست کو قبول کرلیتے ہیں۔ اس عہد وپیمان کو انیسؔ نے ایک بیت میں جس طرح نظم کردیا ہے وہ کہانی کے انجام سے واقف قارئین کے لئے پورے مرثیے سے کم نہیں ہے۔ ؎

فرمایا نہ کڑھ پورے سب ارماں ترے ہوں گے
ہم ساتھ حرم کو لئے مہماں ترے ہوں گے

انیسؔ کا بیانیہ نہایت خوبصورتی سے کہانی کے نشیب وفراز طے کرتا ہوا یہاں تک پہونچا ہے۔ یہاں انیسؔ کہانی میں گریز پیدا کرتے ہیں۔ کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ شیریں خانوادۂ اہلبیت سے جدا ہوتی ہے۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں سے کہانی تاریخ سے کٹ کر روایت کی طرف سفر کرتی ہے۔ لیکن روایت تھوڑی ہی دیر میں پھر تاریخ کی طرف لوٹ آتی ہے۔ کوئی اور کہانی کار ہوتا تو روایت کی بھول بھلیوں میں تاریخ کو فراموش کرجاتا لیکن انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ روایت، تاریخ اور کہانی تینوں کو اپنے بیانیے میں مضبوطی سے باندھے رکھتے ہیں۔ کہانی کا نیا رخ دیکھئے: ؎

اک کوہ پہ تھا قلعہ کہ گھر اس کا تھا اس جا
واں پہنچی تو شیریں کے ہوا حسن کا چرچا

تھا ایک یہودی کہ وہ طالب ہوا اس کا
شیریں نے سنا جب تو پیام اس کو یہ بھیجا
گر ہے مرے وصلت کی تمنا ترے جی میں
تو کفر کو تو، چھوڑ کے آ دین نبی میں

اپنی کہانی کے لئے انیسؔ کو جو ماحول دینا ہے۔ اس کی بنیاد انیسؔ نے اس بند میں رکھ دی۔ ایک یہودی امیر کا شیریں کے حسن پر فریفتہ ہونا۔ پیغام عقد بھیجنا، جواباً شیریں کا یہودی کو مشرف بہ اسلام ہونے کی شرط لگانا۔ ساری جزئیات کہانی میں آنے والے موڑ کی تمہید معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں شیریں کی شادی کا واقعہ روایت کے سہارے رونما ہوتا ہے۔ لیکن انیسؔ کا مقصد کہانی میں آنے والے پیچ وخم کے لئے فضا کو سازگار بنانا ہے۔ دیکھیئے انیس یہاں روایت کے سیلاب میں بہے نہیں ہیں بلکہ کس قدر اختصار کے ساتھ روایت پر ایک نظر ڈال کر تاریخ کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انیسؔ اپنی کہانی کا پیراہن بنانے کے لئے تاریخ کے دامن میں روایات کے موتیوں سے کشیدہ کاری کرتے جارہے ہیں۔

شیریں اپنی ازدواجی زندگی کے دن گذار رہی ہے۔ اب مرثیے میں شیریں کے عشق حسینؑ اور فرقت حسینؑ میں اس کے اضطراب کا بیان شروع ہوتا ہے۔ مرثیے کے مسلسل سات بند حسین کے وعدے کا انتظار اور شوق انتظار میں شیریں کی اضطراری کیفیات کی ترجمانی پر مشتمل ہیں:

کہتی تھی کہ یارب مرا گھر شہ کو دکھانا
وہ دن ہو کہ ہو زینب وکلثوم کا آنا
شبیر ادھر کو کہیں جلدی ہوں روانہ
اس لونڈی پہ اب شاق ہے تشریف نہ لانا
آقا مرے کیا جانے کب آئیں گے ادھر کو
کیا پھر کبھی دیکھوں گی میں زہرا کے پسر کو

کہتی کبھی ہمسایوں سے یہ بیٹھ کے باہم
آویں گے مدینے سے یہاں سید اکرم
خاتون قیامت ہے جو مخدومۂ عالم
اب بیٹیوں سے ان کی ملادیں گے تمہیں ہم
احمد کی زیارت شہ والا کی ملاقات
زینبؑ کی ملاقات ہے زہراؑ کی ملاقات

اے بیبیو آقا ہیں مرے صادق الاقرار
آنے کو کہا ہے مرے گھر آئیں گے اک بار
زہرا کے چمن سے یہ مکاں ہوئے گا گلزار
فرزند نبی کا تمہیں دکھلائیں گے دیدار
آنکھیں قدم سبط پیمبر پہ ملیں گے
ہم دور تلک لینے کو مولا کے چلیں گے

رہتا تھا یہی اس کو تردّد سحروشام
اندوختہ کرتی تھی ضیافت کا سرانجام
جو میوے تھے مرغوب امام ذوی الاکرام
ان میووں کو منگواتی تھی دے دے کے وہ انعام
شوہر کوئی تحفہ جو اسے دیتا تھا لاکر
حضرت کے لئے رکھتی وہ کشتی میں لگا کر

تھا دھیان کہ آؤیں گے سفر سے شہ والا
کورے گھڑوں میں پانی بھرا رکھتی تھی ٹھنڈا
دن ڈھلتا تو شوہر سے یہ کرتی تھی تقاضا
شہ آتے نہ ہوں شہر کے ناکے پہ ذرا جا
آمد ہوا گر لشکر حضرت کی ادھر سے
میں بھی چلوں شہزادیوں کے لینے کو گھر سے

یہ شہ کے ہے لشکر کا نشاں اور یہ آثار
آگے علم سبز لئے ہوگا علمدار
ہوئیں گے عزیز ورفقا گھوڑوں پہ اسوار
اور بیچ میں ہوگا خلف حیدرؑ کرار
ملبوس رسولؐ عربی ہووئے گا بر میں
تیغ اسد اللہ لگی ہوگی کمر میں

ناموس کی کچھ فاصلے سے ہوگی سواری
آوے گی نظر حضرت زینبؑ کی عماری
ہودج میں سوار آئے گی شہزادی ہماری
اور محملوں میں ہوویں گی سیدانیاں ساری
آگے یہ نقیبوں کا سخن ہووئے گا سب سے
خاموش چلے جاؤ تفاوت سے ادب سے

یہاں انیسؔ نے اپنی تخئیل کو شیریں کا تخیل بنادیا ہے۔ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہاں انیسؔ کی تخئیل کا کہیں کوئی دخل ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ایک ماہر نفسیات کی مانند انیسؔ شیریں کے تخیل کے پیچ وخم کو پڑھتے جارہے ہیں اور اپنے لفظوں کے سہارے انہیں مرثیے کے پیکر میں ڈھالتے چلے جارہے ہیں۔ شیریں کا تصور مزاج خانوادۂ رسالت، اس کے جاہ وحشم اور شان وشوکت کے مطابق سوار اور پیادوں کے مقامات کو ترتیب دیتا جاتا ہے لیکن جب یہ تصور حقیقت سے روشناس ہوتا ہے تو شکست خواب کی ساری اذیتوں اور زمانے کی نیرنگیوں کا مرثیہ بن جاتا ہے۔ ؎

آگے یہ نقیبوں کا سخن ہووئے گا سب سے
خاموش چلے جاؤ تفاوت سے ادب سے

کیوں! مرثیہ ہوا یا نہیں! یہاں شیریں انتظار واضطرار کی شدت سے دوچار ہورہی ہے اور ادھر امام حسینؑ اپنے اعزا واںصار کے ساتھ کربلا کے دشت میں شہید ہوچکے ہیں۔ انیسؔ تھوڑی دیر کے لئے کہانی کو یہیں روک دیتے ہیں اور نہایت اختصار وجامعیت کے ساتھ کل دس، گیارہ بندوں میں قتل سید الشہداء، اہل حرم کی اسیری، طوق وسلاسل میں سید سجاد کی گرفتاری، مقتولین کی لاشوں پر بیواؤں اور یتیموں کی گریہ وزاری، لشکر اعدا کی شقاوت قلبی، قیدیوں پر تعزیر وتعدی، شدت الم سے عابد بیمار کی شکستہ پائی، زینب وام کلثوم کی زبوں حالی کا ماجرا بیان کرتے ہیں۔ جہاں قیدیوں کے ہونٹوں پر بکا کے الفاظ ہیں، لاش حسینؑ سے زینب کی گفتگو ہے قتل کے بعد بھی امام حسینؑ کے لبوں پر یاد خدا کے کلمات ہیں۔ یتیموں کے بین ہیں، اشقیا کی گھڑکیاں ہیں، پیاسے بچوں کو نفسیاتی اذیت پہنچانے کے لئے پانی سے بھرے ہوئے گھڑے ہیں۔ یہ سب بیانیہ کا وہ خوبصورت حصہ ہیں کہ قاری

اپنے آپ کو ان مناظر میں شامل نظر آنے لگتا ہے۔

کہانی پھر ایک نئے اور اہم موڑ کی طرف مڑتی ہے۔ یہاں کہانی تاریخ کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن یہاں انیسؔ کے بیانیے نے تاریخ میں بھی کہانی جیسا حسن پیدا کر دیا ہے۔ اہل حرم اسیر ہو کر کربلا سے دمشق کی طرف روانہ ہیں۔ نیزوں پر شہیدوں کے سر بلند ہیں۔ جس نیزے پر حسینؑ کا سر بلند ہے وہ نیزہ ایک دوراہے پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ حسینؑ کا بریدہ سر میدانی راستے پر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ چونکہ دوسرا کہساری راستہ قلعۂ شیریں کی طرف سے ہو کر گذرتا ہے۔ کہانی کا یہ موڑ بڑا معنی خیز ہے۔ امام حسینؑ شیریں کے گھر مہمان ہونے کے اقرار کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ وعدے کی ایفا کا وقت آ پہنچا ہے سر حسینؑ سے اس اعجاز کے نمایاں ہونے پر انیسؔ عابد بیمار اور اشقیا کے بیچ یہ مکالمہ ادا کراتے ہیں۔

گھبرا کے لگے کہنے یہ عابد سے ستمگار
رکنے کا سرشاہ کے ظاہر کرو اسرار
فرمانے لگے روکے یہ تب عابد بیمار
ہے مخبر صادق کا پسر صادق الاقرار
اعجاز ہوا یہ جو سر سبط نبی سے
اس راہ میں مہمانی کا وعدہ ہے کسی سے

اور کہانی پھر ایک بار مرثیے کا مطلع دہرانے لگتی ہے۔ ''اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ'' قافلہ قلعۂ شیریں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شیریں کو اطلاع ہوتی ہے کہ امام حسینؑ کا قافلہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اس کے گھر کی جانب آ رہا ہے ایک مدت سے انتظار کھینچنے والے عاشق صادق پر زیارت محبوب کا مژدہ پا کر جو کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ نہایت فطری انداز میں انیسؔ اس کا بیان کرتے ہیں۔

اس مژدے کو سنتے ہی جو خوش ہوگئی شیریں
بولی کی ہوئی اب دل بے تاب کو تسکیں
صد شکر کی خالق نے نہ رکھا مجھے غمگیں
وعدہ جو کیا تھا اسے بھولے نہ شہ دیں
اب چل کے قدم پر شہ والا کے گروں گی
دن میرے پھرے گرد میں آقا کے پھروں گی

عورات محلہ کو بلا کر یہ سنایا
دو تہنیت اے بیبیو آقا مرا آیا
وہ روز مبارک مجھے قسمت نے دکھایا
اب عرش کے پائے سے ہے بڑھ کر مرا پایا
کونین میں ممتاز کیا شاہ زمن نے
لونڈی کو سرافراز کیا شاہ زمن نے

مرثیے کے اگلے دو بند شیریں کی ہمسایہ عورتوں کے اشتیاق زیارت کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ جو شیریں کے انتظار کی شدت اور حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کے یقین کے ساتھ اس مقدس گھرانے کے احترام کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ شیریں حسینؑ کی ڈیوڑھی سے جدا ہونے کے بعد بھی حسینؑ کے گھر کو کوئی دم بھول نہیں پائی اور اپنے ہمسایوں سے اس نے حسینؑ کے گھرانے کی عظمتوں کا تذکرہ اس انداز میں کیا کہ تمام اہل قریہ قافلۂ حسینؑ کی زیارت کے مشتاق نظر آنے لگے۔ قافلۂ حسینؑ سے شیریں کے ہمسایوں کا یہ جذباتی لگاؤ دیکھئے۔

سب نے کہا خوش ہو کے ہمیں بھول نہ جانا
ہم کو بھی بہن حضرت زینبؑ سے ملانا
شہزادی کا اپنی ہمیں دیدار دکھانا
قسمت سے ہوا فاطمہ کے لال کا آنا
حضرت کی سواری کا حشم دیکھیں گے ہم بھی
سردار دوعالم کے قدم دیکھیں گے ہم بھی

عباس علی کے قدوقامت کے ہیں مشتاق
اور قاسم مہرو کی بھی طلعت کے ہیں مشتاق
زینبؑ کے جگر بندوں کی صورت کے ہیں مشتاق
ہم شکل پیمبر کی زیارت کے ہیں مشتاق
گلرو ہے کوئی ان میں کوئی غنچہ دہن ہے
کہتے ہیں بڑے حسن پہ زہراؑ کا چمن ہے

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ آنے والے مہمانوں کے انتظار میں شیریں کی بے قراری شدید ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنے محترم اور باوقار مہمانوں کے لئے کہیں کرسی بچھاتی ہے، کہیں مسند، کہیں حجرے میں رکھی ہوئی نذر کی کشتیاں سجاتی ہے۔ کبھی اضطراب و اضطرار میں صحن کے دروازے پر جاتی ہے۔ یہیں کہانی میں Thrill کا اضافہ ہوتا ہے۔ مدت سے ہجر کا غم کھینچنے والی شیریں شام ہوتے ہوتے امید و بیم کی منزلوں سے گذرنے لگتی ہے۔ انیسؔ شیریں کی امید و یاس کا بیان اس طرح کرتے ہیں۔

دن ڈھل گیا اور جب نہ ہوئی آمد سرور
شوہر سے کہا اب تو نہایت ہوں میں مضطر
جا دیکھ تو اترا ہے کہاں شاہ کا لشکر
کہیو قدم پاک کو آنکھوں سے لگا کر
شیریں کی ہے یہ عرض کہ اب آیئے مولا
لونڈی کو قریب آ کے نہ ترسایئے مولا

شیریں کا شوہر قلعے سے نیچے اتر کر نووارد قافلے تک پہنچتا ہے۔ لیکن وہ جس تصور کو یہاں لے کے آیا تھا معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ وہ عمر سعد کے خیمے کے نگہبانوں سے کبھی عون و محمد کو پوچھتا ہے کبھی عابد بیمار کو کبھی علی اکبر، کبھی عباس کے خیمے کا پتہ پوچھتا ہے کبھی خیمہ ناموس کی ڈیوڑھی لیکن اس کی حیرت نامرادیوں میں بدل جاتی ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ لشکر حسینؑ کا نہیں بلکہ قاتلان حسینؑ کا ہے جو ناموس حسینؑ کو گرفتار کر کے لایا ہے۔ دیکھئے شیریں کا شوہر کیسے مناظر سے دوچار ہوتا ہے۔

سیدانیاں بیٹھی ہیں وہ چہرے پہ ملے خاک
زینبؑ ہے وہی ماتمی پہنے ہوئے پوشاک
وہ بانوئے بے کس ہے گریبان کئے چاک
بیٹھی ہے وہ کلثوم بہن شاہ کی غم ناک
کبریٰ ہے وہ زانو پہ جھکائے ہوئے سر کو
وہ بالی سکینہ ہے جو روتی ہے پدر کو

ہم عرض کر چکے ہیں کہ انیسؔ کو بیانیہ کے فن میں مہارت حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کہانی کو کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے کس کس پیچ وخم سے گذرنا ہے۔ اس لئے وہ ہر آنے والے موڑ کے لئے کہانی کی ابتدا میں فضا سازگار کرتے چلے جاتے ہیں۔ عقد کے وقت شیریں کی شرط زن وشوہر کے درمیان تفاوت کی مظہر ہے۔ انیسؔ شیریں کے شوہر کا جیسا کردار دکھانا چاہتے ہیں کہانی کے آخر تک وہی کردار باقی رہتا ہے۔ چنانچہ شیریں کے اضطرار پر شوہر کا قلعے سے نیچے اتر کر لشکر گاہ تک آنا اور وہاں کا منظر دیکھ کر سر وسینہ پیٹتے ہوئے لوٹنا کردار کے مزاج کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

کہانی کا اگلا موڑ نہایت اہم اور معنی خیز ہے۔ وہ کوہ الم جو شہادت حسینؑ کی خبر سن کر شیریں پر گرا اور اس پر شیریں اور اس کے شوہر کا ردّعمل، انیسؔ کے بیانئے کا ایک اہم جز ہے۔ یہاں انیسؔ تاریخ کی واقعیت پر قدم رکھے کھڑے ہیں اور ان کا تخیل شیریں کے اضطراب اس کے شوہر کی سراسیمگی اور حسینؑ کے لٹے ہوئے بے یارو بارہ مددگار قافلے کی غیرت وحیا کو دیکھ رہا ہے۔ انیسؔ کے بیانیے کا فن اپنے قاری کو اس بزم غم میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ ؎

شیریں تھی جو یاں منتظر سبط پیمبر
رونے کا جو اک شور سنا ہوگئی ششدر
دیکھا کہ چلا آتا ہے سر پیٹتا شوہر
ڈیوڑھی پہ سراسیمہ نکل آئی کھلے سر
چلا کے کہا کس نے تمہیں لوٹ لیا ہے
جلدی ارے لوگو کہو یہ ماجرا کیا ہے
سر پیٹ کے تب شوہر شیریں یہ پکارا
بی بی ترے آقا کو ستمگاروں نے مارا
زہراؑ کا پسر خلق سے جنت کو سدھارا
سادات کا تو قافلہ لوٹا گیا سارا
بھیجا تھا جہاں تو نے وہ لشکر ہے شقی کا
سرکاٹ کے لائے ہیں حسینؑ ابن علیؑ کا
تو منتظر اب کس کی ہے کون آئے گا بی بی
عابد ہے سو بیمار ہے رانڈیں ہیں سو قیدی
شیریں نے کہا پیٹ کے سر کوٹ کے چھاتی
ہے ہے مرے سید، مرے آقا، مرے والی
لٹوا کے گھر اور تیغ سے کٹوا کے سرآئے
فرمایا تھا آؤں گا سویوں میرے گھر آئے
یہ کہہ کے چلی پیٹتی اور دیتی دہائی
رستے میں کہیں گر پڑی ٹھوکر کہیں کھائی
اک بار خبر آنے کی شیریں کے جو پائی
زینبؑ نے کہا ہائے سلامت نہیں بھائی
پرسے کو وہ آئی ہے سو یاں گھر بھی نہیں ہے
منھ کا ہے سے ہم ڈھانپیں کہ چادر بھی نہیں ہے

انیسؔ کہانی کو یہاں تک لا کر شیریں کے اس بین کو اجاگر کرتے ہیں جو وہ شہادت حسینؑ کے المیے پر قافلۂ اہل حرم میں آ کر کرتی ہے۔ یہ بین فطرت اور حقیقت سے اتنا نزدیک ہے کہ قاری خود کو کسی سانحے پر بین کرنے والی مستورات کے درمیان کھڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شیریں بین کرتے کرتے اس نیزے کے پاس پہنچ جاتی ہے جس پر امام حسینؑ کا خون آلودہ سر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ شیریں کبھی اپنی شہزادی کے بے وارث ہونے پر گریہ کرتی ہے، کبھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے شہزادے کی خستگی پر فریاد کرتی ہے، کبھی اجڑی ہوئی گودوں کا ماتم کرتی ہے کبھی خود سر حسینؑ سے مخاطب ہو کر بین کرتی ہے:

آقا تری اس خوں بھری تصویر کے واری
میں مر نہ گئی ہائے بلالے کے تمہاری
اس بین سے شیریں نے کی جو گریہ وزاری
نیزے پہ سرشاہ کے آنسو ہوئے جاری
پیدا یہ لب خشک سے حضرت کے صدا تھی
کیوں روتی ہے شیریں یہی مرضیٔ خدا تھی

حسینؑ اپنے بریدہ سر سے شیریں کے لئے تشفی کے وہ کلمات ادا کرتے ہیں جو کردار حسینؑ کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔ حسینؑ کا سر ایسے عالم میں بھی حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے اور عہد کی ایفا کرنے پر شکر ادا کرتا ہے۔ بین وبکا کے اس ماحول میں بریدہ سر خود اپنے کنبے کی مظلومی کی داستان دہرانے لگتا ہے۔ شیریں سے سر حسینؑ کا مکالمہ دیکھئے: ؎

زینبؑ کی خبر لے کہ ہے قیدی مری خواہر
بنت اسد اللہ کے سر پر نہیں چادر
ہے خاک سے کبریٰ نے چھپایا سرانور
شہزادی تری آج ہے بلوے میں کھلے سر
احسان کا یہ وقت ہے عبرت کی یہ جا ہے
وہ قیدی ہے جس نے تجھے آزاد کیا ہے
سیدانیوں کو چادریں کچھ لا کے اڑھادے
رانڈوں کی مدد کر کہ خدا تجھ کو جزادے
راضی ہوں نبیؐ صاحب تطہیر دعا دے
محشر میں تجھے حلّۂ فردوس خدا دے
بے وارث ووالی ہیں گرفتار بلا ہیں
محتاج کفن ہم ہیں یہ محتاج ردا ہیں

صاحب عزا کنبے میں ایک نئے مہمان کے داخلے پر زینبؑ کے زخم کچھ اور ہرے ہو جاتے ہیں۔ گریہ وشیون کی فضا ایک اور نیا رخ لے لیتی ہے۔ خود زینبؑ سر حسینؑ سے مکالمہ کرنے لگتی ہیں:

جیتی ہے بہن کس لیے کڑھتے ہو برادر
تن پر تو ہے سر گو مرے سر پر نہیں چادر
گردن پہ تو بہنا کے پھر ایا نہیں خنجر
لاشہ تو مرا دھوپ میں جلتا نہیں دن بھر
غم کھاؤ نہ چادر جو نہیں پاتی ہوں بھائی
بالوں سے تو منھ ڈھانپے چلی جاتی ہوں بھائی

شیریں کا گریہ وشیون بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں شیریں کا کرب اور اس کا ناسٹلجیا قابل دید ہے۔ زینبؑ تو یہ کہتی تھی سرشاہ سے روکر
چلاتی تھیں شیریں کہ میں صدقے ترے سرور
ان آنکھوں کی تعریف کیا کرتے تھے اکثر
کیوں ہونہ گئے کور مرے دیدۂ انور

ہوتیں نہیں سیر آپ کے دیدار سے آنکھیں
لاؤ تو ملوں چاند سے رخسار سے آنکھیں

یہاں بیانیہ کی قوت آپ نے ملاحظہ کی۔شاید یہ کہانی کا کلائمکس ہوتا اگر یہ مرثیہ انیسؔ کی تخلیق نہ ہوتا لیکن انیسؔ ایک مرثیہ نگار کی ذمہ داری نباہتے ہوئے کہانی کے بیانیے کو بھی فوت نہیں ہونے دیتے اور مرثیے کو بھی دم نہیں توڑنے دیتے۔ انیسؔ کہانی میں ایک اور موڑ لے آتے ہیں جو روایت اور تاریخ دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔شیریں عمر سعد کے لشکر کو زر و مال کا لالچ دے کر سر حسینؑ اور اسیران حرم کو اپنے یہاں ایک شب مہمان رکھنے کی اجازت حاصل کر لیتی ہے۔اور اہلبیت حسینؑ ایک شب کے لئے شیریں کے گھر مہمان ہوجاتے ہیں۔کہانی قاری کو ایک اور نئی بزم میں لے جاتی ہے جہاں مدت سے آلام و مصائب میں گرفتار حسین کا غیور گھرانہ ایک ہمدرد اور عقیدت مند کے گھر میں قیام کرتا ہے۔اپنی وضع داریوں اور غیرتوں کے ساتھ ایک کنیز کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے خانوادۂ رسالت کے افراد جس عسرت و زبوں حالی کی کیفیات سے دوچار ہوئے ہیں انیسؔ کی تخئیل انہیں اس طرح اپنے لفظوں میں ڈھال لیتی ہے:

چلاتی تھیں بانو مرے سید مرے سرور
شیریں کے گھر آئے مجھے اس حال میں لے کر
لپٹی ہوئی کہتی تھی سرشاہ سے خواہر
مہمان بہن آئی ہے سر پر نہیں چادر
غیرت سے موئی جاتی ہے صدمہ ہے بہن پر
ثابت نہیں کُرتا بھی سکینہ کے بدن پر

حسینؑ اور ان کے اہلبیت کی تواضع کے لئے شیریں نے جو کھانے اپنے گھر تیار کرائے تھے وہ اہلبیت سے ان پر حسینؑ کی فاتحہ دینے کی درخواست کرتی ہے۔ عابدؑ بیمار فاتحہ دیتے ہیں۔رانڈوں میں پھر ایک کہرام برپا ہوجاتا ہے۔ایسے عالم میں بیبیوں کے یہ بین دیکھئے:

روکر کہا زینبؑ نے بہن ہوگئی واری
میں جیتی ہوں اور فاتحہ ہوتی ہے تمہاری
کیا پیاس تھی جس دم تھا لہو زخموں سے جاری
پانی نہ کسی نے دیا مانگا کئی باری

میر انیس نمبر

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔انہیں میں سے ایک 'میر انیس نمبر' بھی شامل ہے۔ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔اس کی قیمت ۱۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

جب تم تھے تو ملتا تھا نہ پانی کہیں بھائی
اب پانی تو موجود ہے اور تم نہیں بھائی
روتی ہوئی اتنے میں اٹھی بانوئے بے پر
اک دودھ کا کوزہ رکھا اک پانی کا ساغر
سجاد سے رورو کے کہا اے مرے دلبر
ان دونوں پہ دو فاتحۂ اکبر و اصغر

مارے گئے کس ظلم و جفا سے مرے بچے
تھے تین شب و روز کے پیاسے مرے بچے

وہ ضبط گریہ جو ابھی تک ہم کہانی میں سید سجادؑ سے دیکھتے آئے ہیں۔شیریں سے حسینؑ کی فاتحہ دلانے کی پیش کش پر اس کا باندھ بھی ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ ایک موت کے گھر میں جہاں وقت نے دھیرے دھیرے شور گریہ کو کم کر دیا تھا اچانک ایک بار پھر مرنے والوں کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں اور بین و بکا کی صدائیں بلند ہوجاتی ہیں۔یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ وہ عزادار ہیں جن پر قتل حسینؑ کے بعد سے لے کر اب تک گریہ و شیون پر پابندی بھی تھی اور جو کسی ہمدردی جتانے والے کی عدم موجودگی کے احساس سے بھی دوچار تھے۔اب کہانی میں ایک ایسا کردار داخل ہوچکا ہے جس کی بدولت ایک شب کے لئے گریہ و شیون پر سے پابندی بھی اٹھ گئی ہے اور جو اس مجلس شیون میں ان کا ہمدرد بن کر ان کا شریک بھی ہے۔

فاقہ شکنی کا جو اسیروں نے سنا نام
پیٹے یہ سروسینہ کہ برپا ہوا کہرام
زینبؑ نے کہا کھانے کا ہے کون سا ہنگام
نے چین محمدؐ کو نہ زہراؑ کو ہے آرام
کیا کھانے کو ہے ہم کھائیں کہ دل غم سے بھرا ہے
لاشہ تو ابھی بھائی کا جنگل میں پڑا ہے

بھائی تو ہے بے گور و کفن کھاؤں میں کھانا
بے دفن ہو فرزند حسنؑ کھاؤں میں کھانا
بے سر علی اکبرؑ کا ہو تن کھاؤں میں کھانا
پامال ہو زہراؑ کا چمن کھاؤں میں کھانا
رونا مجھے دیکھے سے چلا آتا ہے لوگو
لے جاؤ کہ کھانا مجھے یہ کھاتا ہے لوگو

ناچار ہو اک جام کو شیریں نے اٹھایا

پاس آن کے ہونٹوں سے سکینہ کے لگایا
بولی کی پیوواری دم آنکھوں میں ہے آیا
منھ پھیر کے شیریں کو سکینہ نے سنایا
پیاسے مرے بابا موئے میں بھی نہ جیوں گی
عباسؑ چچا آئیں گے جب پانی پیوں گی

شیریں کی فاقہ شکنی کی یہ درخواست اسیروں کے زخموں کو کریدتی ہے۔ قیدیوں کا یہی کہرام مرثیے کو اختتام تک پہونچاتا ہے کہانی کے اختتام تک پہونچتے پہونچتے انیسؔ نے ایک اجڑے ہوئے گھر کے کہرام کو جس سچائی اور فطری پن کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا ہے وہ انیسؔ کے بیانیے کا خاص حصہ ہے۔ جہاں انیسؔ نے ایک ایک فرد کی زبان سے ایک ایک مصرعے میں اپنے اپنے عزیز کا مکمل مرثیہ کہلوادیا ہے۔

انیسؔ نے جس فضا میں جس مرثیے کا آغاز کیا ہے وہاں سے کہانی کئی موڑ لیتی ہوئی اختتام تک پہونچتی ہے۔ یہ پیچ وخم ایسے نازک تھے کہ کسی بھی موڑ پر کہانی کار کے بہک جانے یا بھٹک جانے کا خطرہ بنا ہوا تھا۔ لیکن کہانی کے کس موڑ پر ٹھہرنا ہے۔ کس موڑ سے سرسری گذر جانا ہے۔ کہاں اختصار سے کام لینا ہے۔ کہاں تفصیل سے انیسؔ اس رمز سے خوب واقف ہیں۔ جہاں ٹھہرنا ضروری ہے وہاں انیسؔ ٹھہرے ہیں۔ جہاں نگاہ ڈال کر گذر جانا تھا وہاں انیسؔ نگاہ ڈال کر گذر گئے ہیں۔ تاکہ کہانی کا اصل مقصد بھی فوت نہ ہو۔ کہانی کا تجسس اور دلچسپی بھی کم نہ ہونے پائے۔ کہانی کا کلائمکس کہاں اور کس طرح ہونا چاہئے اور اس کا تقاضا کیا ہے سب پر انیسؔ کی مکمل دسترس ہے۔ اکثر کہانیوں میں دیکھا گیا ہے کہ راستے کے پیچ وخم میں

انیسؔ نے جس فضا میں جس مرثیے کا آغاز کیا ہے وہاں سے کہانی کئی موڑ لیتی ہوئی اختتام تک پہونچتی ہے۔ یہ پیچ وخم ایسے نازک تھے کہ کسی بھی موڑ پر کہانی کار کے بہک جانے یا بھٹک جانے کا خطرہ بنا ہوا تھا۔ لیکن کہانی کے کس موڑ پر ٹھہرنا ہے۔ کس موڑ سے سرسری گذر جانا ہے۔ کہاں اختصار سے کام لینا ہے۔ کہاں تفصیل سے انیسؔ اس رمز سے خوب واقف ہیں۔ جہاں ٹھہرنا ضروری ہے وہاں انیسؔ ٹھہرے ہیں۔ جہاں نگاہ ڈال کر گذر جانا تھا وہاں انیسؔ نگاہ ڈال کر گذر گئے ہیں۔ تاکہ کہانی کا اصل مقصد بھی فوت نہ ہو۔ کہانی کا تجسس اور دلچسپی بھی کم نہ ہونے پائے۔ کہانی کا کلائمکس کہاں اور کس طرح ہونا چاہئے اور اس کا تقاضا کیا ہے سب پر انیسؔ کی مکمل دسترس ہے۔

الجھ کر منزل کھو جاتی ہے۔ کہیں اختصار کہانی کی معنویت کا قاتل بن جاتا ہے، کہیں تفصیل۔ انیسؔ جیسا ماہر کہانی کار ان سارے عناصر کو نگاہ میں رکھ کر کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ کلائمکس تک پہنچنے کے لئے جن اسباب وعلل کی ضرورت ہے اس کے لئے وہ کہانی کی ابتدا سے ہی فضا سازی میں مصروف نظر آتا ہے۔ کس کردار کو کہاں اور کس وقت منظر میں داخل ہونا ہے۔ کس کردار کو کب اور کہاں منظر سے باہر ہوجانا ہے۔ اس کو پوری احتیاط سے برتنے میں انیسؔ سے زیادہ ماہر فنکار کون ہوگا؟ انیس نے کہیں بھی بڑوں سے چھوٹوں کے اور چھوٹوں سے بڑوں کے، آقا سے غلام کے، اور غلام سے آقا کے کام نہیں لئے ہیں۔ کس کردار کی زبان پر کون سا فقرہ سجتا ہے۔ کہاں مکالمے کا کیا انداز ہونا چاہئے۔ انیسؔ سب جانتے ہیں۔ چنانچہ کسی ظالم سے شریفانہ فقرہ یا کسی محترم شخصیت سے عامیانہ گفتگو انیسؔ کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ انیس کردار کو اس کے کام کی مناسبت سے مزاج اور نفسیات بخشتے ہیں۔ جو کردار تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ان کے مزاج اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ہی انیسؔ نے مکالمے اور منظر نامے تخلیق کئے ہیں۔ انیس نے جہاں روایت کو تاریخ پر حاوی نہیں ہونے دیا وہیں تاریخ کو تاریخ کی طرح خشک اور بے روح بھی نہیں بنادیا ہے بلکہ اس میں اپنے بیانیے کی قوت سے کہانی کا حسن پیدا کردیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ انیسؔ کی کہانی پر تاریخ کی صداقتوں کی مہر اور انیسؔ کے بیان کردہ تاریخی واقعے پر کہانی کی دلکشی کا گمان گذرتا ہے۔ یہی انیسؔ کی کہانی کا فن ہے یہی انیسؔ کے بیانیے کی عظمت ہے۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

نوحوں کا ایک گمنام شاعر: ثریاؔ

وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ
موبائل: 8172845795

حال ہی میں مرثیوں کی ایک بوسیدہ اور ناقص جلد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔جس میں میر عشقؔ کے مراثی کی جلد اول اور تعشقؔ کے مرثیوں کی چوتھی جلد شامل ہے۔ اس میں میر عشقؔ کے سلام و رباعیوں کے ساتھ تعشقؔ کی رباعیاں اور سلام وغیرہ بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ اس جلد میں سو(۱۰۰) سے زیادہ نوحے ثریاؔ کے ہیں ثریاؔ تخلص کا یہ شاعر کون تھا اور اس کا اصل نام کیا تھا اور یہ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کا حال معلوم نہیں۔ رثائی ادب کے محققین نے بھی اپنی تحقیق میں ثریاؔ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جہاں تک میں نے پڑھا ہے مجھے بھی کسی کتاب میں ثریاؔ کا نام نظر نہیں آیا۔

البتہ ان نوحوں کے آخر میں تین خمسے ایسے ہیں جو ثریاؔ کی زندگی پر تھوڑی بہت روشنی ڈالتے ہیں۔ان میں پہلے دو خمسے نواب محبوب محل صاحبہ محبوبؔ کے سلاموں کے ہیں اور تیسرا خمسہ سید محمد عابد ادیبؔ ابن نواب میر محمد حسین کے سلام لگائے گئے مصرعوں کا ہے۔ پہلے کے دو خمسوں کی ابتدا میں ثریاؔ نے لکھا ہے۔مصرعہ ہیچ مدان برسلام جناب معظمہ مکرمہ محتشمہ نواب محبوب محل صاحبہ دامت ظلہا المتخلص بہ محبوبؔ پہلا خمسہ اکیس بند کا ہے۔یہ اس کا پہلا اور آخری بند ہے۔

سفر تمام ہوا شاہ کا محرم میں
مقام امام کا تھا کربلا محرم میں
کیا سلوک اس امت نے کیا محرم میں
سلامی اشکوں کا دریا بہا محرم میں
کہ شہ پہ آب رواں بند تھا محرم میں

عزائے شہ میں ثریاؔ کو ہے بکا مرغوب
کہ ہے ثواب عبادت کا کیوں نہ روئے خوب
بروز حشر یہی مغفرت کا ہے اسلوب
اٹھا تو فکر زمانہ کو دل سے اے محبوبؔ
حسینؑ کی صف ماتم بچھا محرم میں

دوسرا خمسہ بارہ بند کا ہے۔اس کا پہلا اور آخری بند لکھا جاتا ہے۔

مہ صیام کی اکیسویں غضب لائی
گھٹا الم کی دل اہل بیتؑ پر چھائی
....
صدائے مَاتِ علیؑ فلک نے سنوائی
سلامی کیوں نہ قیامت جہان میں آئی
....
شہادت آج جناب امیر نے پائی
مہ صیام ثریاؔ پے عزا کم ہے
....
کہ تین راتیں بھی اک عشرہ محرم ہے
ابوالائمہ کے غم سے جو چشم پر نم ہے
....
جہاں میں آج یہ محبوبؔ اس کا ماتم ہے
کہ جس کے در پہ ملک کرتے ہیں جبیں سائی

سید محمد عابد ادیبؔ کے سلام پر ثریاؔ نے جو مصرعے لگائے ہیں، اس کے آغاز میں انہوں نے لکھا ہے۔مصرعہ ہیچ مدان برسلام جناب سید محمد عابد تنویرالدولہ بہادر المتخلص بہ ادیبؔ ابن نواب میر محمد حسین خاں صاحب، ثریاؔ کا یہ خمسہ ستائیس بند کا ہے۔ اس کا پہلا اور آخری بند اس طرح ہے۔

میں جو رووں غم شہ میں تو یہ ساماں ہوجائے
قطرہ اشک مرا لعل بدخشاں ہو جائے
موئے مژگاں سے خجل پنجہ مرجاں ہوجائے
خوں فشاں کر مری چشم گہر افشاں ہوجائے
مجرئی دامن صحرا بھی گلستاں ہوجائے
....
عمر تضعیف کو پہنچی ہے قریب اب یارب
جز ترے کون دعا کا ہے مجیب اب یارب
بس ثریاؔ کو زیارت ہو نصیب اب یارب
آرزو دل میں یہی ہے کہ ادیبؔ اب یارب
زائر مرقد سلطان خراساں ہوجائے

نواب محبوب محل محبوبؔ کے حالات تلاش کے باوجود نہیں مل سکے۔ان کے نام و القاب سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ نوابی خاندان سے تھیں۔سید محمد عابد ادیبؔ کے حالات بھی نہیں معلوم ہوسکے۔نواب میر محمد حسین خاں نام کے ایک مشہور رئیس لکھنؤ میں تھے۔ان کے تھوڑے بہت حالات چند شعرا کے حوالوں میں ملتے ہیں۔ہوسکتا ہے سید محمد عابد ادیبؔ انہی کے فرزند ہوں۔

نواب میر محمد حسین خاں معتمدالدولہ نواب آغا میر کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔آغا میر کی ڈیوڑھی پر ان کی محلسرا تھی۔ان کا شمار لکھنؤ کے رئیسوں میں تھا۔شاعری میں میر مونسؔ برادر انیسؔ کے شاگرد تھے۔امیر تخلص تھا۔ان کی مثنوی ''نظم رہ نما'' ۱۲۸۶ء میں شائع ہوئی تھی جس کے سرورق پر ان کا نام نواب

سید محمد حسین خاں صاحب رضوی دام اقبالہ نبیرہ وزیر الوزرا نواب معتمد الدولہ آغا میر مغفور لکھا ہے۔ یہ چھ ہزار وثیقہ پانے والے نواب امیر مرزا کے داماد تھے۔ان کے نوحوں کا ایک مجموعہ ''سروغم'' بھی چھپ چکا ہے۔ایک نوحے کے مقطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجلسیں پڑھتے تھے اور زیارات کر چکے تھے۔

کیا تشنگی حشر کا ہوخوف امیرؔ اب
زائر بھی ہوں ذاکر بھی شہ تشنہ دہاں کا

نواب میر محمد حسین خاں سے میر مونسؔ کے گہرے مراسم تھے۔ وہ روزانہ میر مونسؔ کی ملاقات کو ان کے گھر آتے تھے اور دیر تک نشست رہتی تھی۔ نواب اپنے مکان پر ہر مہینے کی چھبیسویں تاریخ کو مجلس کرتے تھے۔ یہ مجلس بہت اہم تھی اور میر مونسؔ کے لئے مخصوص تھی۔ اس مجلس میں میر مونسؔ ہر مرتبہ نو تصنیف مرثیہ پڑھتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ انہی مجلسوں سے ایک میں میر مونسؔ نے سلام کا یہ شعر پڑھا تھا جو انیسیوں دبیریوں میں ایک شعری معرکے کی بنیاد بن گیا۔

بھلا تردد بے جا سے ان میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

ثریاؔ کے ان خمسوں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ میر مونسؔ (متوفی ۱۲ شوال ۱۲۹۲ھ) کے زمانے یا اس کے بعد کے شاعر ہیں۔ بہر حال زمانہ جو بھی رہا ہو جب تک ثریاؔ کے حالات زندگی نہیں ملتے یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔عزاے شہ میں نوحہ ایک ایسی صنف ہے جو ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ اگر نوحہ نہ ہوتا تو کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ نوحہ کرنے والوں نے کس کس انداز میں اہلبیت کے مصائب بیان کئے ہیں اور نوحوں میں کون سی ایسی خصوصیت ہے جو سننے والوں کو تڑپا دیتی ہے۔

ثریاؔ کے نوحوں کا یہ مجموعہ اسی پر درد تاثیر سے عبارت ہے جو نوحے کو نوحہ بناتی ہے۔ان میں بھی کربلا کے وہی مصائب ہیں جو دوسرے شعرا نے نظم کئے ہیں مگر اثیرؔ نے ان مصائب کو جس طرح نظم کیا ہے اس میں اس رنگ سخن کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔ثریاؔ کے نوحوں کا یہ انداز ہے۔

اے مومنو ہلال محرم عیا ں ہوا
مجروح سیف غم دل اہل جہاں ہوا

.....

اس سال خوب روئیے اور سر کو پیٹیے
جی بھر کے اگلے سال کب آہ و فغاں ہوا

.....

حال اپنا غیر کیجئے بالوں کو کھولئے
اس سال ہم سے نالہ ول شیون کہاں ہوا

.....

حال حسینؑ سن کے سر وسینہ پیٹئے
سر جس کا بعد قتل کے زیب سناں ہوا

.....

بھوکا و پیاسا ہاتھ سے شمر لعیں کے آہ
خنجر سے ذبح رن میں شہ دوجہاں ہوا

.....

جب جاکے قتل ہوگئے عباس نامدار
لشکر مام عصر کا تب بے نشاں ہوا

.....

تاریخ دوسری تھی محرم کی مومنو
وارد جو کربلا میں امام زماں ہوا

.....

آدم سے لے کے اور رسول خداؐ تلک
یہ ظلم و جور سچ کہو یارو کہاں ہوا

نوحہ

کہتے تھے یہ رو کر شہ ابرار علمدار
مظلوم برادر کے مددگار علمدار

.....

سب مرکے گئے سوئے جناں پیش پیمبرؐ
باقی ہے فقط عابد بیمار علمدار

.....

کشتہ ہوئے افسوس علی اکبر و قاسم
بھائی کو کیا بیکس و لاچار علمدار

.....

ہو دور مرض جلد شفا پائے ثریاؔ
اب اے خلف حیدر کرار علمدار

نوحہ

شہ کہتے تھے کل ہم کو کہاں پاؤ گی زینبؑ
بن بھائی کے تم عصر کو ہوجاوگی زینبؑ

.....

صغرا سے یہ کہنا کہ مری یاد نہ بھولے
جب شام سے تم پھر کے وطن جاوگی زینبؑ

.....

خیمہ کو جلائیں گے مرے لوٹیں گے ناری
سر کھولے تم اس دشت میں چلاوگی زینبؑ

.....

بھیا ترے اس صبر کے قربان برادر
ان بازو کو رسی میں بندھواؤ گی زینبؑ

.....

مشتاق زیارت کا تمہارے ہے ثریاؔ
کب روضہ پہ مداح کو بلواؤ گی زینبؑ

ثریاؔ کے حالات نہیں مل سکے اس کا مجھے افسوس ہے۔ایک اچھا شاعر ہونے کے باوجود وہ گمنام رہ گئے۔ان کے نوحے بھی لوگوں کو یاد نہیں۔ اگر اتفاق سے مراثی کی یہ جلد میرے ہاتھ نہ لگتی تو میں بھی جان نہ پاتا کہ عزاداری کے مرکز لکھنؤ میں ایک ایسا شاعر ہیں گزرا ہے جس کے نوحے متوجہ کرتے ہیں۔ان کے نوحوں کی سب سے بڑی خصوصیت وہ سوگوار فضا ہے جو دلوں کو برما دیتی ہے۔

صغرا کا بیاں تھا کہ مری یاد بھلائی پردیس میں جاکر
بھیا علی اکبر نے خبر بھی نہ منگائی پردیس میں جاکر

.....

بین کرتی تھی بانو یہ رو کر چل بسے تم تو دنیا سے اصغر
دودھ کس کو پلائے یہ مضطر چل بسے تم تو دنیا سے اصغر

.....

سر پیٹ کے صغرا نے کہا اشک بہا کر اکبر کو سنا کر
تم بھول نہ جانا مجھے اللہ برادر پردیس میں جاکر

امید ہے کہ میرے اس تعارفی مضمون کے بعد لوگ ثریاؔ کو اتنا گمنام نہیں رہنے دیں گے اور اتنی پہچان ضرور دیں گے جس کے وہ مستحق ہیں۔

❑❑❑

شارب ردولوی کی رثائی تنقید

ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق
صدر شعبۂ اردو حسین آباد گورنمنٹ کالج لکھنؤ
موبائل: 9452292302

رثائی ادب کو اردو ادب میں ابھی باقاعدہ کسی دبستان کی حیثیت حاصل نہیں ہے خود مرثیے کی ادبی عظمت کو اردو ادب میں ایک طویل مدت کے بعد تسلیم کیا گیا ہے جبکہ رثائی ادب میں ایک انتقادی دبستان بننے کی صلاحیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے رثائی ادب میں مرثیے کے علاوہ نوحے، سلام، رباعیات، دہے اور زاری وغیرہ بھی شامل ہیں رثائی ادب کے ناقدین میں مولانا الطاف حسین حالی، امداد امام اثر، شبلی نعمانی، مسعود حسن رضوی ادیب، شارب ردولوی، مسیح الزماں، نیر مسعود، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، اکبر حیدری کشمیری، فضل امام رضوی، احسن فاروقی، زماں آزردہ، ضمیر اختر نقوی، ہلال نقوی، عاشور کاظمی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں نیز نئی نسل میں عباس رضا نیر، فاضل ہاشمی، لئیق رضوی اور ارتضیٰ عباس نقوی کی تنقیدی تحریروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ شبلی نعمانی نے مرثیے کی ادبی حیثیت کو قائم اور مستحکم کرنے کے لئے موازنہ لکھ کر غیر معمولی ادبی کارنامہ انجام دیا ہے ہر چند کہ حالی اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی پیشکش کے لحاظ سے مرثیے کو عربی اور فارسی شاعری پر فوقیت دے چکے تھے بلکہ انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ''حق یہ ہے کہ اس نئی طرز تعلیم کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے۔'' اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ نے ہر عہد میں اپنی معنوی قوت اور موضوعاتی وسعت کے سبب ارباب نقد کو اپنی طرف ملتفت کیا ہے جبکہ اسی مرثیے کو قدرت اللہ شوق نے اپنا تذکرہ لکھتے وقت ''غلطی الفاظ بسیار'' کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا اور مصحفی نے بھی مرثیہ گویوں کے طرز کو ''مطلقاً ناپسندیدہ'' قرار دیا تھا۔

معاصر عہد میں بھی مرثیے کو مذہبی شاعری کہہ کر جس طرح نصاب سے خارج کرنے کی کوششیں زور پکڑ رہی ہیں اس سے آپ کو کیا لگتا ہے کہ اس طرح کی تحریکوں سے مرثیے کی ادبی اہمیت کو کم یا ختم کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، اگر یہ اسیران نقد جامد اور فریفتگانِ شہرت مستعجل اس وہم میں مبتلا ہیں تو ان کے اس وہم کو توڑنے کے لئے شمس الرحمن فاروقی کا یہ قول کافی ہے کہ ''مرثیے کی مذہبی حیثیت سے ہمیں کوئی بحث نہیں کیونکہ اس کی ادبی حیثیت اس کے مذہبی پہلو کی لازماً تابع نہیں ہے۔'' ظاہر ہے مرثیے کے سلسلے میں اس طرح کے اشکالات وارد کرنا یا مرثیے کو محض تاریخی یا واقعاتی شاعری کہہ کر نظر انداز کرنا، رثائی ادب کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کی خفیف الحرکاتی وہی حضرات کرتے ہیں جنہوں نے رثائی ادب کا سرسری مطالعہ کیا ہے جبکہ بقول شبلی نعمانی ''مرثیہ اپنی ادبیت کے باعث سنجیدہ تنقیدی مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔'' چنانچہ مرثیے کے ادبی تقاضے جس سنجیدہ مطالعے اور تنقیدی بصیرت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ سنجیدہ مطالعہ اور تنقیدی بصیرت معاصر عہد میں اگر کہیں دستیاب ہے تو وہ رثائی ادب کے مجتہد العصر اور حجۃ الادب شارب ردولوی کے مقالات میں ہے شارب ردولوی کا شمار بظاہر عملی و نظریاتی تنقید کے ماہرین میں ہوتا ہے مگر رثائی تنقید میں بھی ان کا انفراد و امتیاز قائم ہے۔ فی زمانہ وہ رثائی تنقید کے سرآمد نقاد ہیں اور ان کی پہلی ہی کتاب ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' رثائی تنقید کے حوالے سے بنیادی اور اساسی اہمیت کی حامل ہے۔

''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' آج سے ۶۱ سال قبل ۱۹۵۷ء میں اس وقت لکھی گئی تھی جس وقت مرثیہ کے ساتھ ڈرامے کا لاحقہ لگانے کے لئے جرأت چنگیزی در کار تھی کیونکہ اس وقت تک مرثیہ روایتی معتقدین کے حصار میں تھا حتیٰ کہ شبلی کا موازنہ بھی مذہبی حلقوں میں بہت زیادہ پسند نہیں کیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے مرثیے کی ادبی معنویت پر زیادہ زور دیا تھا اور واقعات کربلا کے اخلاقی پہلوؤں پر بہت کم روشنی ڈالی تھی، مذہبی حلقوں کی ناراضی کا خیال ہی مرثیے کے پہلے جدید نقاد حالی کے پیش نظر رہا ہوگا جس کی وجہ سے مقدمہ میں انہوں نے مرثیے کے موضوع اور اس میں بیان کئے جانے والے واقعات کو انتہائی عقیدت و احترام سے تحریر کیا ہے جس کے نتیجے میں مرثیے کی ادبی اہمیت ان کی عقیدت کی نذر ہوگئی ہے۔ غالباً انہیں باتوں کو ذہن میں رکھ کر شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مضمون ''مرثیے کی معنویت'' میں لکھا ہے: ''مرثیے کو اگرچہ الہامی یا مقدس متن کا درجہ حاصل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ایک طرح کا احترام اور تکریم ضرور وابستہ ہے لہٰذا مرثیہ کے بارے میں کوئی تنقیدی رائے ظاہر کرنا آسان نہیں۔'' میں سمجھتا ہوں فاروقی

کے اس قول سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ۶۱ سال پہلے مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر کو تلاش کرنا کتنا جوکھم بھرا کام تھا اور نہ صرف ڈرامائی عناصر کو تلاش کرنا مزید برآں مذہبی اور ادبی حلقوں میں ان ڈرامائی عناصر کا مرثیہ سے متعلق قابل قبول انسلاکات کے ساتھ شارب ردولوی کا سرخ رو ہونا کسی ادبی معجزے سے کم نہیں ہے۔

بہت کم ایسے ناقدین ہیں جنہیں ان کی پہلی ہی کتاب نے ادبی دنیا میں معتبر و مستند بنا دیا ہو، شارب ردولوی انہیں خوش بختوں میں ہیں جنہیں ان کی پہلی کتاب نے شہرت کے آسمانوں پر پہنچا دیا تھا یہ شارب ردولوی کا کمال فن ہے کہ وہ آج تک انہیں ارزشوں پر ٹھہرے ہوئے ہیں جہاں انہیں ان کی پہلی کتاب نے پہنچایا تھا ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' میں وہ ایک معتدل اور خوشگوار نقاد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں اور ان کے اسلوب کا وہ اعتدال آج بھی ان کا اختصاص ہے اس کتاب میں انہوں نے ڈرامے کی تعریف، مرثیے کی ابتداء اس کی ہیئت اور واقعہ کربلا کے معنوی ابعاد، مرثیے میں واقعات کا ظاہری ارتباط و انسلاک، کردار نگاری کی اہمیت، مرثیے میں تصادم، کشمکش اور عمل نیز مرثیے اور ڈرامے میں مماثلتی عناصر کی نشان دہی بڑی ہنرمندی سے کی ہے۔ شارب ردولوی اس کتاب کے آخری باب ''کیا مرثیہ ڈراما ہے'' میں تحریر کرتے ہیں:

''ہم دیکھتے آئے ہیں کہ ڈرامے اور مرثیے کے عناصر ترکیبی الگ الگ ہیں جنہیں آپس میں دور کا بھی لگاؤ نہیں، ڈرامے کے عناصر صدیوں میں ارتقائی منزل طے کرنے کے بعد اب اس حالت میں پہنچے ہیں کہ انہیں ایک مکمل شکل میں پیش کیا جاسکے مثلاً واقعہ، مکالمہ، تصادم، کشمکش، کردار اور عمل وغیرہ، اسی طرح مرثیے کے عناصر بھی ایک طویل مدت میں مرتب ہوئے ہیں جو چہرہ، سراپا، رخصت، آمد اور رجز وغیرہ ہیں مرثیے کے انہیں عناصر پر نقادوں نے زور دیا ہے جو ظاہری طور پر بادی النظر میں ڈرامے کے عناصر سے بالکل مختلف معلوم ہوتے ہیں پھر بھی یہ ترتیب واقعہ سے لے کر تصادم، عمل اور کشمکش تک مرثیہ میں مشابہت اور اشتراک کے نمایاں پہلو لئے ہوئے ہیں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں گو مرثیے کے عناصر ترکیبی میں مکالمہ تصادم، عمل اور کشمکش کے نام کے کوئی عناصر نہیں ہیں لیکن اس کے گہرے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ مرثیہ میں عمل کی

آپ نے دیکھا کہ شارب ردولوی نے محولہ اقتباس میں کس طرح مرثیے اور ڈرامے کے عناصر ترکیبی میں معنوی ربط پیدا کیا ہے اور کس خوش اسلوبی سے بظاہر متضاد عناصر میں ارتباط و انسلاک قائم کیا ہے اور کس طرح کشمکش اور تصادم جن کا مرثیے سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں باہمی تعلق پیدا کیا ہے نیز مرثیے میں کردار کس طرح زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر متحرک ہوتے ہیں اسے دلیل و براہین سے پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے انہیں ابتدائی دور میں ہی اردو تنقید کی اہم ترین شخصیات میں شامل کر دیا تھا۔
عرض کیا جاچکا ہے کہ مرثیے کو کبھی مذہبی شاعری کہہ کر اور کبھی اس کی معنویت کو محض تاریخی بتا کر مسترد کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

فراوانی بھی ہے اور کشمکش اور تصادم اپنے نقطۂ عروج پر موجود ہے کردار زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور متحرک بھی ہیں۔''

(مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر۔ص ۴۱، ۴۲ مطبوعہ ۱۹۵۹ لکھنؤ)

آپ نے دیکھا کہ شارب ردولوی نے محولہ اقتباس میں کس طرح مرثیے اور ڈرامے کے عناصر ترکیبی میں معنوی ربط پیدا کیا ہے اور کس خوش اسلوبی سے بظاہر متضاد عناصر میں ارتباط و انسلاک قائم کیا ہے اور کس طرح کشمکش اور تصادم جن کا مرثیے سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں باہمی تعلق پیدا کیا ہے نیز مرثیے میں کردار کس طرح زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر متحرک ہوتے ہیں اسے دلیل و براہین سے پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے انہیں ابتدائی دور میں ہی اردو تنقید کی اہم ترین شخصیات میں شامل کر دیا تھا۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ مرثیے کو کبھی مذہبی شاعری کہہ کر اور کبھی اس کی معنویت کو محض تاریخی بتا کر مسترد کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ شارب ردولوی اپنی کتاب ''اردو مرثیہ'' کے مقدمہ میں مرثیے پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کے عظیم ذخیرے میں مرثیے کو ایک بڑی اہم اور انفرادی حیثیت حاصل ہے یہ اس لئے نہیں کہ اس کا تعلق مذہب یا عقیدے سے ہے حالانکہ دنیا کے ادب میں جن نظموں کا آج تک کوئی ثانی نہیں ہے ان میں بیشتر نظموں کے محرک مذہبی واقعات اور عقائد تھے.....دراصل نہ مرثیوں کی عظمت کا سبب مذہب و عقائد ہیں اور نہ ان عالمی ادب کے عظیم رزمیوں کی عظمت کا سبب ان کے لکھنے والوں کے عقائد تھے عظمت ان واقعات کی انسانی قدروں میں ہے ان واقعات کو اپنے تخلیقی عمل میں ڈھالنے میں اور اظہار کے ان طریقوں میں ہے اور ان سب چیزوں نے مل کر اسے عالمی کلاسیک یا کسی ادب کی عظیم تخلیق کا درجہ دیا ہے۔''

آپ نے دیکھا! شارب ردولوی نے کس طرح مرثیہ کا دفاع (Defence) کیا اور نامعقول اعتراضات کا کس قدر معقول جواب دے کر منکرین رثاء کو رثائی عظمتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اب وہ یا تو دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود ان فن پاروں کو مسترد کر دیں جن کا تعلق مذہبی عقائد و اقدار سے ہے یا پھر

مرثیے کو اس کی فنی رفعتوں کے ساتھ قبول کرلیں۔

شارب ردولوی کے نزدیک مرثیہ مذہبی جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہونے کی وجہ سے عظیم تخلیق نہیں ہے بلکہ وہ فنی محاسن اور ان تہذیبی اقدار کی وجہ سے عظیم ہے جو رثائی شاعری کا اختصاص ہیں وہ مزید لکھتے ہیں:

''اگر صرف مذہبی جذبات کا اظہار کسی تخلیق کو بڑا بنا سکتا تو ایسی بے شمار تخلیقات جن سے آج کوئی واقف بھی نہیں ہے ادب کا بیش قیمت حصّہ ہوتیں... مرثیے کی انفرادیت اور اہمیت کا سبب بھی وہی ہے جو عالمی ادب کی ان تخلیقات کا ہے جن میں مذہبی عقائد کا اظہار کیا گیا ہے یعنی واقعے کی انسانی قدریں اور اخلاقی قدریں، زبان و بیان کی سحر کاری، اظہار و اسلوب کی دل پذیری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری پر مکمل قدرت... انیس و دبیر نے مرثیے میں یہ تمام محاسن جمع کر دیئے تھے اسی لئے آج اردو مرثیے کو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔''

یہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ رثائی تنقید میں شارب ردولوی کی ایک اور کتاب ''مرثیہ اور مرثیہ نگار'' کلیدی اہمیت کی حامل ہے اس کتاب میں آپ نے مرثیے کے متعلق کئے جانے والے غیر ضروری سوالات کا جواب بڑے مدلل اور مسکت انداز میں دیا ہے مثلاً آج کے زمانے میں مرثیے کی کیا معنویت ہے؟ انیس و دبیر کے عہد میں مرثیے کی معنویت کا جو تعین کیا گیا تھا وہ آج بھی کارآمد و مفید ہے؟ کیا عہد حاضر میں مسدس کی ہیئت میں مرثیے کی معنویت مفقود ہو چکی ہے؟ کیا آج اچھے مرثیے لکھے جا رہے ہیں؟ یا کوئی صنف سخن منسوخ یا نامقبول ہو جائے تو اس صنف کی وکالت کا جواز کیا ہے؟ یا مرثیے کا موازنہ مغربی اصناف سے کرنا درست ہے؟ یہ اور اسی طرح کے بہت سے سوالات کا اطمینان بخش جواب محولہ کتاب میں مل جائے گا اسی کتاب میں وہ ایک مقام پر مرثیے اور شخصی مرثیے کی توضیح کس خوبصورتی سے کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''یہاں پر دو باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اول یہ کہ مرثیے سے یہاں پر مراد شخصی مرثیے نہیں ہیں بلکہ صرف وہ مراثی ہیں جو واقعات کربلا کو بیان کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ شخصی مراثی کو کسی کے انتقال پر اظہار غم کی وجہ سے مراثی میں شامل کر دیا گیا ہے حالانکہ اصولاً انہیں مرثیہ کہنا ہی غلط ہے اس لئے کہ وہ مرثیے کے لغوی معنی کو بھی پورا نہیں کرتے۔ انہیں تعزیتی نظم کہنا چاہئے، ان میں کسی رثائی صورت کے بجائے مرنے والے سے صرف تعلق خاطر کا ذکر کیا جاتا ہے۔''

(اردو مرثیہ: تلاش ہیئت کا سفر)

منقولہ اقتباس میں آپ نے دیکھا کہ شارب ردولوی شخصی مرثیے کو مرثیے کے زمرے میں رکھنے کو کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک شخصی مرثیہ رثائی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے نیز انہوں نے شخصی مرثیے کے لئے جو نام تجویز کیا ہے ''تعزیتی نظم'' وہ بھی کتنا مناسب ہے شارب ردولوی کا یہ ایک تنقیدی طرز ہے کہ جب وہ کسی شئے پر معترض ہوتے ہیں تو ان کے اعتراض کے پیچھے کوئی نہ کوئی منطق کارفرما ہوتی ہے اور وہ اعتراض برائے اعتراض کے قائل کبھی نہیں رہے جب وہ اعتراض کرتے ہیں تو اس کا کوئی منطقی جواز بھی پیش کرتے ہیں۔

اس مقام پر میں چند اہم ترین نکات کی طرف ملتفت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ شارب ردولوی نے اس کتاب میں شامل اپنے ایک مضمون ''شخصی مرثیے کی روایت اور رفعت سروش'' میں شبلی نعمانی کے حوالے سے حضرت عمر کے زمانے میں خنساء نامی ایک عورت کا ذکر کیا ہے جس نے اپنے بھائی کے انتقال پر اپنے آنسوؤں کو لفظوں میں ڈھال کر ایک مرثیہ کہا۔ اسے شبلی نعمانی نے عربی کا پہلا مرثیہ قرار دیا ہے مجھے حیرت ہے شبلی نعمانی جیسے دیدہ ور ادیب، دانشور نقاد نے خنساء کے مرثیے کو کس طرح عربی کا پہلا مرثیہ قرار دیا ہے جبکہ رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰؐ کی وفات حسرت آیات پر ان کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا کہا ہوا مرثیہ تمام کتب تاریخ میں موجود ہے جس کا یہ شعر بے حد مشہور ہے۔

صبت علیا مصائب لو انّھا
صبت علی الایام صرنا لیالیا

غالباً شارب ردولوی سے سہو ہوا ہے انہوں نے شبلی نعمانی کی اس روایت کو ۱۹۵۷ء میں شائع ہونے

> ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' آج سے ۶۱ سال قبل ۱۹۵۷ء میں اس وقت لکھی گئی تھی جس وقت مرثیہ کے ساتھ ڈرامے کا لاحقہ لگانے کے لئے جرأت چنگیزی درکار تھی کیونکہ اس وقت تک مرثیہ روایتی معتقدین کے حصار میں تھا حتیٰ کہ شبلی کا موازنہ بھی مذہبی حلقوں میں بہت زیادہ پسند نہیں کیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے مرثیے کی ادبی معنویت پر زیادہ زور دیا تھا اور واقعات کربلا کے اخلاقی پہلوؤں پر بہت کم روشنی ڈالی تھی، مذہبی حلقوں کی ناراضی کا خیال ہی مرثیے کے پہلے جدید نقاد حالی کے پیش نظر رہا ہوگا جس کی وجہ سے مقدمہ میں انہوں نے مرثیے کے موضوع اور اس میں بیان کئے جانے والے واقعات کو انتہائی عقیدت و احترام سے تحریر کیا ہے جس کے نتیجے میں مرثیے کی ادبی اہمیت ان کی عقیدت کی نذر ہوگئی ہے۔ غالباً انہیں باتوں کو ذہن میں رکھ کر شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مضمون ''مرثیے کی معنویت'' میں لکھا ہے: ''مرثیے کو اگرچہ الہامی یا مقدس متن کا درجہ حاصل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ایک طرح کا احترام اور تکریم ضرور وابستہ ہے لہٰذا مرثیے کے بارے میں کوئی تنقیدی رائے ظاہر کرنا آسان نہیں۔'' میں سمجھتا ہوں فاروقی کے اس قول سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ۶۱ سال پہلے مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر کو تلاش کرنا کتنا جوکھم بھرا کام تھا۔

والی اپنی کتاب ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' کے صفحہ ۲۴ پر تحریر کیا ہے اور پھر ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''مرثیہ اور مرثیہ نگار'' صفحہ ۱۳۳ پر تقریباً ۴۹ سال کے بعد اسی روایت کو دہراتے ہوئے خنساء کے اشعار کو عربی کا پہلا مرثیہ قرار دیا ہے جبکہ عربی کا پہلا مرثیہ حضرت علیؑ کا وہ مرثیہ ہے جو انہوں نے مومن قریش حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات حسرت آیات پر کہا تھا جو ''دیوان علیؑ'' میں موجود ہے اور دوسرا مرثیہ جناب فاطمہ زہراؑ کا کہا ہوا مرثیہ ہے جو وفات رسولؐ پر کہا گیا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ''مرثیہ اور مرثیہ نگار'' شارب ردولوی کی ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے کے بغیر نہ صحیح طور پر مرثیے کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ مرثیہ نگاروں کو، اس میں مرثیے کی عصری معنویت اور مرثیے کی ہیئت پر بڑی کارآمد بحثیں کی گئیں ہیں۔ انیس و دبیر ہوں یا ساحر و عروض اور رفعت سروش قدیم و جدید مرثیہ نگاروں اور مرثیے کے مختلف ادوار پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جس سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کلاسیکی مرثیے سے جدید مرثیے تک کا سفر اردو مرثیے نے کس طرح طے کیا ہے نیز مرثیہ کا عہد بہ عہد موضوعاتی و اسلوبیاتی ارتقاء کس طرح ہوتا رہا ہے اور کون کون سے وہ عوامل ہیں جنھوں نے مرثیے کو نئے مزاج و منہاج سے آشنا کیا ہے۔

رثائی ادب سے متعلق شارب ردولوی کی تدوینی کتاب ''اردو مرثیہ'' (مطبوعہ ۱۹۹۱ء) بھی اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کتاب میں شارب ردولوی نے تین ایسے ابواب قائم کئے ہیں جو رثائی ادب کے طالب علموں ہی کے لئے نہیں بلکہ اساتذہ کے لئے بھی نفع بخش ہیں پہلا باب تاریخی جائزے، دوسرا باب تنقیدی جائزے اور تیسرا باب شخصی جائزے پر محیط ہے دراصل یہ کتاب دہلی اردو اکادمی کی جناب سے ۱۹۸۷ء میں منعقد ہونے والے سیمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں اس عہد کے ۲۶ نامور و معتبر اہل قلم کے نگارشات شامل ہیں انہیں شارب ردولوی نے ترتیب دیا ہے نیز اس پر ایک انتہائی پُرمغز مقدمہ تحریر کیا ہے جس کا تذکرہ ہم وسط مضمون میں کر چکے ہیں۔

کتاب کے مقدمے میں شارب ردولوی نے مرثیے کی مذہبی اہمیت سے صرف نظر کرتے ہوئے ادبی معنویت پر بحث کی ہے نیز واقعہ کربلا کے انسانی افکار اور اخلاقی اقدار کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے مرثیے کی ہیئت کی تشکیل کس طرح ہوئی اور اجزائے ترکیبی میں کس طرح بتدریج اضافے ہوئے نیز اضافوں کی رثائی ادب میں کیا اہمیت ہے، شارب ردولوی ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں:

''میر خلیق نے بیانیہ کی بنیاد کو مضبوط کیا اور مرثیہ میں سفر کا حال، رخصت اور شہادت کو تفصیل سے بیان کیا، میر ضمیر نے جنگ کی تفصیلات کا اضافہ کر کے مرثیہ میں رزمیہ کے امکانات کو روشن کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سراپا بیان کرنے پر خصوصی توجہ دی، اور اس طرز نوی کو مرثیہ میں اپنا (Contribution) قرار دیا۔ سراپا کے بیان، جنگ کی تفصیلات، رخصت اور سفر کے حالات نے مرثیہ کو جذبات نگاری کا بہت بڑا میدان فراہم کر دیا، جسے میر انیس و مرزا دبیر نے معراج کمال تک پہنچا دیا، کسی چیز کی اس سے زیادہ معراج کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے۔''

(اردو مرثیہ ص ۱۱ و ص ۱۲ مطبوعہ ۲۰۰۱ء دہلی)

شارب ردولوی نے ان تین کتابوں کے علاوہ رثائی ادب پر اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جو ابھی اشاعت کا منتظر ہے اس موضوع پر ان کے بہت سے مضامین بھی ہیں جو ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں، جن میں ''اردو تنقید پر انیس کا اثر'' اور ''انیس اور تلسی داس'' قابل ذکر ہیں رثائی ادب تو ان کی علمی و ادبی کائنات کا محض ایک رخ ہے ورنہ کائنات شارب میں علم و فن کی لاتعداد بستیاں آباد ہیں جن میں ہر بستی ادب کی دارالسلطنت کا درجہ رکھتی ہے۔

❑❑❑

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

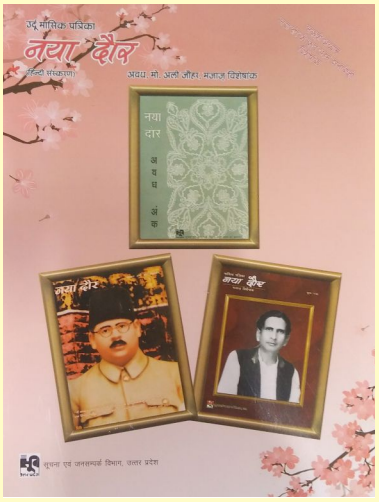

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

مرزا محمد اشفاق شوقؔ کی رثائی شاعری

پروفیسر طلعت حسین نقوی
پرنسپل شیعہ پی جی کالج لکھنؤ
موبائل: 9415962278

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے صدا چاک گریبان سحر بھی
سوداؔ

خطیب العرفان مرزا محمد اشفاق طاب ثراہ کی ہمہ گیر آفاقی شخصیت کے سلسلہ میں لب کشائی یا خامہ فرسائی بڑے بڑوں کے لئے آسان بات نہیں چہ جائے کہ مجھ جیسے کم علم کے لئے تو یہ بات سورج کو چراغ دکھانے جیسی ہے۔ مرحوم ومغفور ایک باغ و بہار، پر اثر، دینی، روحانی وعلمی شخصیت کے حامل تھے۔ انتہائی خوش اخلاق، مشفق، ملنسار، روادار، حامی و مددگار، غریب پرور اور مہربان۔ ادیب، خطیب، مفکر، شاعر، دانشور اور عالم دین تھے۔ بے سہاروں کا ایک بڑا سہارا تھے۔ خلوص ومحبت، ایثار وقربانی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بردباری اور انکساری اتنی تھی کہ

جب بھی سوچا کہ کروں غیر کے عیبوں کا شمار
آئینہ بن کے مری ذات چلی آتی ہے

مرزا محمد اشفاق شوقؔ مرحوم شاعری کے تمام حسن وقبح سے واقف تھے۔ ان کی شاعری کا محور عشق رسول وآل رسول علیہم السلام تھا اسی لئے قصیدہ، سلام، نوحہ اور مرثیہ سے باہر جانا کبھی پسند نہیں کیا۔ مدح اہل بیت علیہم السلام کی وادی بڑی سنگلاخ، پیچیدہ اور نازک ہے۔ اس وادی میں نہ تو افراط کی گنجائش ہے اور نہ تفریط کی۔ اگر چہ قصیدہ گوئی میں کثرت فضائل کی ترجمانی پھر بھی سہل ہے البتہ نوحہ، سلام اور منقبت میں احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانا اور عصمت مآب افراد کے فضائل ومصائب کی ترجمانی اس طرح کرنا کہ شان عصمت پر آنچ نہ آئے، مشکل ڈگر ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: فیّ هلکان محب غال و مبغض قال۔ میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاکت سے دوچار ہوئے۔ ایک محبت میں نمو وانتہا پسندی سے کام لینے والا دوسرا میری عداوت و دشمنی میں مجھے مرتبہ سے گرانے والا۔ اس قول کی روشنی میں مدحیہ اور سبکی دونوں طرح کی شاعری کرنا بہت آسان نہیں۔ دنیاوی شاعری کی راہیں بہ نسبت مذہبی یا تقدیسی شاعری کے بہت آسان ہیں کیونکہ اس کا میدان نہایت وسیع ہے۔ اس میں سینکڑوں مضامین بلا جھجھک پیش کئے جا سکتے ہیں جب کہ مذہبی یا تقدیسی شاعری یعنی حمد، نعت، منقبت اور سلام ومرثیہ وغیرہ کی راہ قطعی آسان نہیں۔ شاعر ان اصناف میں جو مضامین نظم کرتا ہے، ان کا دائرہ محدود ہے اور اس میں ایسے الفاظ ومضامین کا استعمال کیا جات اہے جو ذرّہ برابر بھی یہ احساس نہ دلائیں کہ شاعر نے شرک کی سرحد کو چھولیا ہے۔ اس لئے نعت کا کہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ پل صراط پر چلنے کے برابر ہے۔ اگر ذرا بھی قدم ڈگمگائے تو انسان بلندی سے گر کر پستی میں اور نارِ جہنم میں داخل ہوسکتا ہے۔ بہر کیف مذہبی شاعری کے اصول وقوانین نہایت سخت ہیں۔ اس میدان میں وہی اپنے جوہر دکھا سکتا ہے جس کو تائید خداوندی حاصل ہو۔

اشفاق صاحب نہ صرف قادر الکلام استاد شاعر تھے بلکہ عارف المقام مداح وذاکر آل عبا بھی تھے۔ اس میں کسی کو بھی مجال کلام نہیں ہے کہ موصوف داد و دہش سے بے پروا مدحت سرائی کے دلدادہ تھے۔ ان کا یقین تھا کہ درِ اہل بیتؑ سے وابستگی خود ہی شہرت کا باعث ہوا کرتی ہے پھر اس کے لئے اضطراب کی کیا ضرورت۔ موصوف کو شعر وسخن پر کتنی دسترس تھی یہ ان کے اشعار خود ہی گواہی دیتے ہیں۔ موصوف کے یہاں جو ندرتِ خیال پائی جاتی ہے وہ کم ملتی ہے۔ اس میں شاعر کی اپنی تدبیر و کاوش اور عطائے ربانی دونوں کو دخل حاصل ہے کیونکہ جس قدر دل سے مطالبہ ہوتا ہے، عطا اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ رسول خداؐ اور معصومینؑ کے نام کے وسیلے سے جب خدا سے کو لگائی جائے تو ذہن و فکر پر وحی والہام کے نقوش ابھرنے لازمی ہیں۔ آپ کی مذہبی شاعری کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی ذمہ داری سے بھی کبھی غفلت نہیں برتا کرتے تھے اور شاعرانہ کیفیت سے بھی شعر کو نہیں گرنے دیتے تھے۔ اہل بیتؑ کی شان میں اشعار اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ فن کی حد بندیوں میں رہتے ہوئے جس انداز میں آپ نے مدح سرائی اور مصائب کی تصویر کشی کی ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

روزِ عاشور ہوئے اس طرح سرورؑ کامیاب
بھیک لینے در پہ آیا دہر کا ہر کامیاب
صلح کی محفل ہو یا وہ جنگ کا میدان ہو
مصطفیؐ کی طرح ہیں شبیرؑ و شبرؑ کامیاب
کھولتا ہے جو زباں مدح لسان اللہ میں

ہے وہی شاعر معزز وہ سخنور کامیاب

کربلا میں تین دن کی بھوک و پیاس اور قیامت کی گرمی میں آل رسولؐ کی کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

طلب کرنے پہ ملتا ہے بغیر این و آں پانی
مگر دشت بلا میں خون سے بھی تھا گراں پانی
غضب ہے قہر ہے، سیراب ہو ہر خار و خس لیکن
نہ پائے دشت غربت میں نبیؐ کا گلستاں پانی
نہ جانے کیا دل سرورؑ پہ گزری روزِ عاشورہ
قیامت ہے کہ بوڑھے باپ سے مانگے جواں پانی

رثائی ادب کا سب سے اہم مرکز کربلا ہے کیونکہ کربلا فقط اس سرزمین کا نام نہیں ہے جہاں حق و باطل میں معرکہ آرائی ہوئی تھی بلکہ کربلا انسانی طاقت کا نام ہے، کربلا تہذیب و شائستگی کا نام ہے، کربلا تحریک کا نام ہے، کربلا تعمیر کا نام ہے، کربلا بنی نوع انسان کے کمال کا نام ہے، کربلا عروج بشریت اور تحفظ انسانیت کا نام ہے، کربلا تخریب کاری کی تردید کا نام ہے، کربلا بقائے اسلام اور فنائے باطل کا نام ہے، کربلا دستور شہادت اور آئین ایثار کا نام ہے۔ اس لئے کربلا محدود نہیں لامحدود ہے۔ کربلا علاقائی نہیں، آفاقی ہے، کربلا میراث نہیں، نسل آدم کی جاگیر ہے۔ ہر انقلاب اس کا دست نگر ہے۔ اس لئے اپنی فطرت میں عزائی جذبات رکھنے والا دل اس سے ضرور آشنا ہوتا ہے اور پھر اسے رثائی ادب کا مرکز بناتا ہے۔ رثائی ادب کی اہم ترین صفت نوحہ ہے کیونکہ مرثیہ اور سلام میں مدح و ثنا کے اشعار بھی ہوتے ہیں لیکن نوحہ خالص رثائی صنف ہے۔ مرزا اشفاق شوقؔ مرحوم نوحہ میں جناب علی اکبر کے سلسلہ میں ماں کے جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں:

لیلیٰ نے کہا روکر آجاؤ علی اکبر
ڈھونڈے یہ کہاں مادر آجاؤ علی اکبر
جس طرح مدینہ سے لے کر ہمیں آئے تھے
ویسے ہی چلو لے کر آجاؤ علی اکبر
جو پیار سے بچی کو سرورؑ نے پنہائے تھے
چھینے گئے وہ گوہر آجاؤ علی اکبر

جو نوحے آپ نے کہے ہیں وہ تعداد میں زیادہ ہیں مگر ابھی چھپنے نہیں پائے ہیں۔ مجلس، ماتم اور نوحے کی اہمیت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

کوئی بتائے اس کو کیوں حسرتِ جناں ہے
مجلس ہے بار جس پر ماتم جسے گراں ہے
کوثر کی ہے ضمانت پروانۂ جناں ہے
سینے پہ میرے شہ کے ماتم کا جو نشاں ہے
جنت بغیر حب حیدر نہیں ملے گی
دشمن علیؑ کے تیرا ہر سجدہ رائیگاں ہے
آکر خلیل دیکھیں میدان کربلا میں
شبیرؑ کے لئے یہ اک وقت امتحاں ہے
دردِ جگر سے رن میں اکبرؑ تڑپ رہے ہیں
ہونٹوں پہ یا علیؑ ہے اور قلب میں سناں ہے
فوجیں سمجھ رہی ہیں قرآں لئے کھڑے ہیں
اور دست شاہِ دیں پہ یاں ایک بے زباں ہے
دنیا میں ہو رہا ہے اے شوق شہ کا ماتم
ہر دشمن عزا کا چہرہ دھواں دھواں ہے

خطیب عرفان کے نوحوں میں شاعر کا کمال فکر و فن جلوہ گر ہے۔ آپ کے نوحوں میں واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری میں فطری احساسات کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔ ان میں زور ہے، روانی ہے، تاثیر ہے، الفاظ کی حسین نشست و برخاست ہے، معنی آفرینی ہے اور سب سے اہم نوحہ کی جو بنیادی چیز ہے یعنی رثائیت، وہ بھی بھرپور ہے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط شعری سفر کے دوران انہوں نے سیکڑوں کی تعداد میں نوحوں کہے ہیں۔ یہ نوحے بڑی دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن کربلا خود سے تعلق رکھنے والے کو نہ گم ہونے دیتی ہے، نہ مٹنے

اطلاع

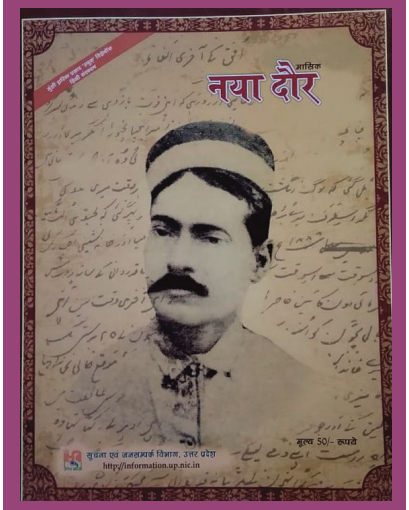

ادارہ ''نیادور'' کی جانب سے شائع ہونے والے ''خمار بارہ بنکوی'' اور ''منشی دواریکا پرشاد افق لکھنوی'' نمبر اب دیوناگری رسم الخط میں بھی دستیاب ہیں۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۵۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۱۰۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

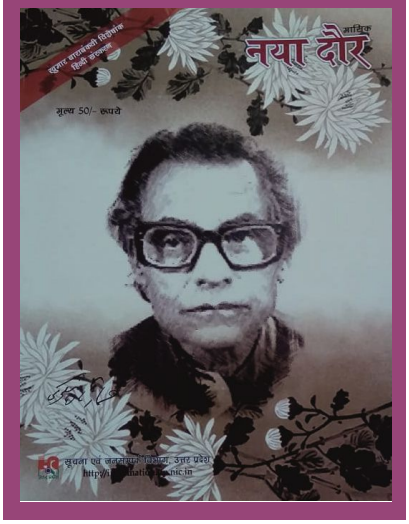

دیتی ہے۔اس طرح شوقؔ صاحب کو دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ رثائی ادب بالخصوص نوحہ نگاری میں بھی یدطولیٰ حاصل ہے۔

اپنی حیات کیوں کر اہل حرم گزاریں
جو خانداں کی جاں تھا لاشوں کے درمیاں ہے
جب چھن رہی تھی چادر جب جل رہے تھے خیمے
کہتی تھی روکے مادر اکبر مرا کہاں ہے
ماری گئی جو برچھی اکبر کو کربلا میں
انسانیت کے دل میں پیوست وہ سناں ہے

'سلام شوق' کے نام سے آپ کا مجموعۂ کلام نظامی پریس سے مارچ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں قطعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔قطعہ ملاحظہ ہو:

سرزمین نور کا ہے نام دنیا میں نجف
کربلا کہتے ہیں جس کو ہے علاقہ نور کا
نور اول نے بنایا ہے بنام اہل بیتؑ
خلد تک جانے کی خاطر ایک رستہ نور کا

شاعر سماج کے بیحد حساس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔وہ آئینۂ حیات میں منعکس ہونے والی تصویریں اور صفحۂ کائنات پر ابھرنے والے نقوش کو چشم بصارت سے نہیں چشم بصیرت سے دیکھتا ہے پھر حقائق کے کشف وادراک کے بعد شعور سے مبدا شعور تک کا سفر طے کرتا ہے۔شاعری نہ صرف افکار و خیالات کے گہرہائے غلطاں تراشنے کا نام ہے بلکہ اس میں جذبات کی فطری عکاسی اور احساسات کی حقیقی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔کوئی بھی صنف سخن ہو اس میں یہ تصورات ضرور موجود ہوتے ہیں۔البتہ رثائی یا تقدیسی شاعری تو احساسات و جذبات کے پرتو بغیر نامکمل ہے۔

ہے ماتم تشنگی کا مجلسیں تشنہ دہانی کی
کلیجے میں لگی ہے شوق میرے آگ پانی کی
مقدر سے ملا ہے نقش پائے فاتح خیبر
میری ٹھوکر پہ ہے اب سلطنت دنیائے فانی کی

مرزا محمد اشفاق شوقؔ مرحوم شاعری کے تمام حسن وقبح سے واقف تھے۔ان کی شاعری کا محور عشق رسول و آل رسول علیہم السلام تھا اسی لئے قصیدہ، سلام، نوحہ اور مرثیہ سے باہر جانا کبھی پسند نہیں کیا۔مدح اہل بیت علیہم السلام کی وادی بڑی سنگلاخ، پیچیدہ اور نازک ہے۔اس وادی میں نہ تو افراط کی گنجائش ہے اور نہ تفریط کی۔اگر چہ قصیدہ گوئی میں کثرت فضائل کی ترجمانی پھر بھی سہل ہے البتہ نوحہ، سلام اور منقبت میں احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانا اور عصمت مآب افراد کے فضائل ومصائب کی ترجمانی اس طرح کرنا کہ شان عصمت پر آنچ نہ آئے، مشکل ڈگر ہے۔حضرت علیؑ فرماتے ہیں: فیّ هلكان محب غال و مبغض قال۔ میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاکت سے دوچار ہوئے۔ایک محبت میں نمو و انتہا پسندی سے کام لینے والا دوسرا میری عداوت و دشمنی میں مجھے مرتبہ سے گرانے والا۔اس قول کی روشنی میں مدحیہ اور سبکی دونوں طرح کی شاعری کرنا بہت آسان نہیں۔دنیاوی شاعری کی راہیں بہ نسبت مذہبی یا تقدیسی شاعری کے بہت آسان ہیں کیونکہ اس کا میدان نہایت وسیع ہے۔اس میں سینکڑوں مضامین بلا جھجک پیش کئے جاسکتے ہیں جب کہ مذہبی یا تقدیسی شاعری یعنی حمد، نعت، منقبت اور سلام و مرثیہ وغیرہ کی راہ قطعی آسان نہیں۔شاعر ان اصناف میں جو مضامین نظم کرتا ہے، ان کا دائرہ محدود ہے اور اس میں ایسے الفاظ و مضامین کا استعمال کیا جات اہے جو ذرّہ برابر بھی یہ احساس نہ دلائیں کہ شاعر نے شرک کی سرحد کو چھولیا ہے۔اس لئے نعت کا کہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔بعض نے کہا کہ یہ پل صراط پر چلنے کے برابر ہے۔اگر ذرا بھی قدم ڈگمگائے تو انسان بلندی سے گر کر پستی میں اور نارِ جہنم میں داخل ہوسکتا ہے۔بہرکیف مذہبی شاعری کے اصول وقوانین نہایت سخت ہیں۔اس میدان میں وہی اپنے جوہر دکھا سکتا ہے جس کو تائید خداوندی حاصل ہو۔

تمنا ہے درِ مولا پہ میرا دم نکل جائے
نہیں اے خضر خواہش مجھ کو عمرِ جاودانی کی
پدر سے ہوکے رخصت سوئے میداں جب چلے اکبر
نظر میں پھر گئی تصویر احمدؐ کی جوانی کی
وضو کرنے سے پہلے سید سجادؑ روتے تھے
عطش کو یاد کرکے فاطمہ زہراؑ کے جانی کی

یوں تو دنیا سب کے لئے ہی ایک سرائے خانہ اور گزرگاہ ہے۔اس نے ماضی میں کسی سے وفا کی نہ حال میں کرتی ہے اور نہ مستقبل میں کرے گی لیکن جز جز ہے، گِل گِل ہے، گُل گُل ہے۔گلدستہ گلدستہ ہے، گلستاں گلستاں چمن چمن ہے، چمنستاں چمنستاں، قطرہ قطرہ، دریا دریا، ذرہ ذرہ ہے خورشید خورشید۔خطیب العرفان مرزا محمد اشفاق مرحوم جز کی نسبت کل تھے۔گِل کی نسبت گُل تھے۔گلدستہ کی نسبت گلستاں، چمن کی نسبت چمنستاں، قطرہ کی نسبت دریا تھے۔ذرہ کی نسبت خورشید درخشاں تھے۔آپ ایسا گُل تھے جس کا عطر سب کو مرغوب تھا۔ایسا گلدستہ تھے جو سب کی زینت تھا، ایسا گلدستہ تھے جو سب کی بہار تھا، ایسا چمنستاں تھے جو سب کا منظور نظر اور سب کے لئے نشاط آور تھا۔ایسا دریا تھے جو سب کے لئے سودمند وموافق تھا۔ایسا خورشید تھے کہ جو سب کو فیض بخشتا تھا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا بہ بخشد خدائے بخشندہ

بہرکیف تمام کمالات وصفات کے پہلو بہ پہلو آپ کا نام تخیل کی پرواز، استعارہ سازی اور مضمون آفرینی میں منفرد اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔گلستان عقیدہ وعمل میں لالہ وگل کی چلمنوں میں پوشیدہ خاروں سے چمن کو صاف کرکے آراستہ کرنے کا ہنر اس باغبان کو خوب آتا ہے۔

رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

❑❑❑

رثائی ادب کے دل نشیں سخنور: نیّر سلطانپوری

انجینئر در الحسن
450/36, kha/20، مفتی گنج لکھنؤ
موبائل: 9450549586

مجھے علامہ اقبال کا ایک استفہامیہ شعر یاد آرہا ہے۔ علامہ سوال کرتے ہیں۔

سخن میں سوز ، الٰہی کہاں سے آتا ہے؟
یہ چیز وہ ہے جو پتھر کو بھی گداز کرے

اگر اس حقیر بے مایہ سے پوچھئے تو اس کا جواب (شاید) یہی ہو کہ سوز کا اصلی (Source) خلوص اور عقیدت ہے۔ ثبوت درکار ہو تو نیّر سلطانپوری کا مجموعہ کلام 'انوار عرفاں' پڑھئے۔ اس میں مناقب وفضائل اہلبیتؑ کے دوش بدوش پُر سوز مصائب کا بھی بیان ہے۔ امام حسینؑ اوران کے جانباز ساتھیوں نے سرزمین کربلا پر اپنے خون سے جو داستان تقریباً چودہ سو سال پہلے رقم کی تھی اس کا ذکر بھی رنج وغم والم کی دل سوز زبان میں ہے۔ تاریخ اسلام کے پُر درد واقعات اور قوم وملت کی خوابیدہ زندگی پر آب حیات چھڑکنے کی بات بھی ان کی نظموں میں نظر آئیگی۔

جہاں تک رثائی ادب کا سوال ہے، رثا، کا مفہوم ہے، رنج وغم وملال اور رثائی ادب یعنی کسی مظلوم کے اوصاف ومحامد کے ساتھ اس کی مصیبتوں ،موت (شہادت) اور درد انگیز واقعات کو نظم یا نثر میں رقم کرنا، رثائی ادب کی تاریخ جناب آدم سے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ فراق جنت میں گریہ اور جناب حوا کی جدائی پر اظہار غم والم تاریخ انبیا کا جُز ہے۔ پھر اپنی قوم کی بدحالی پر جناب نوح کا اسقدر گریہ کرنا کہ نام ہی نوح پڑ گیا۔ یہ بھی تاریخ انبیا کا حصہ ہے۔ فراق یوسفؑ میں حضرت یعقوبؑ کی رثائی کیفیت قرآن حکیم میں درج ہے۔ لیکن یہ سب (Pre Historic) ماقبل تاریخ کے) واقعات ہیں۔

نیر سلطانپوری نے جو رثائی ادب پیش کیا ہے وہ جیتی جاگتی تاریخ کا حصہ ہے۔ یعنی ذکر حسینؑ امام حسینؑ کے ذکر جمیل کو چھیڑتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

> یہ فطرت کا تقاضہ ہے، جو مسلسل ہمارے مشاہدہ میں رہتا ہے کہ چاہے کتنا ہی عظیم غم کیوں نہ ہو وقت گزرنے کے ساتھ مدھم ہوتا جاتا ہے، ماں باپ کے لئے اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے بڑا کوئی غم نہیں ہے مگر وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد چند آہوں اور ہلکی سی آنکھوں کی نمی تک محدود ہوجاتا ہے، صرف اور صرف یہ حسینؑ کا غم والم ہے جو بچپن سے شروع ہوتا ہے۔ جوانی میں بڑھتا ہے۔ اور ضیعفی میں بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ نیّر مرحوم اسے بالکل نئے انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس رثائی ترقی کو معجزہ قرار دیتے ہیں۔

اے دل حق آشنا حق آگہی کی بات کر
ہے طبیعت مضمحل کچھ تازگی کی بات کر
تیرگی ہے ہر طرف تابندگی کی بات کر
دل منور جس سے ہو اس روشنی کی بات کر
نور چشم فاطمہ جان نبی کی بات کر
آج محفل میں حسین ابن علی کی بات کر
کربلا میں جس نے دیکھا جلوہ حق روبرو
اور خدا سے گفتگو کی زیر خنجر دو بدو
بے بدل جس کی شہادت بے بہا جس کا لہو
کارنامہ جس کی جرات کا جہاں میں چارسو
مقتضائے وقت ہے تو بھی اسی کی بات کر
آج محفل میں حسین ابن علی کی بات کر

رثائی ادب کا منبع ومخزن آنسو ہے۔ ذکر حسین ہو، واقعات کربلا بیان ہوں اور آنکھوں میں آنسو نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ اس حقیقت کو نیّر بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

امڈ آتے ہیں آنکھوں سے غم شبیر میں آنسو
یہ بادل خود برس جاتے ہیں برسائے نہیں جاتے

اسلام ، دشمن باطل پرست کئی لاکھ یزیدی فوج کے مقابلہ میں مختصر سی حسینی سپاہ جس میں ۸۰ رسال کے کمر خمیدہ بوڑھے بھی ہیں اور چھ ماہ کا شیرخوار بچہ بھی ہے۔

اس عالم میں امام حسینؑ نے موت وحیات کی جنگ کا مرقع پیش کیا جس میں موت کو شکست ہوئی اور حیات کو لافانی زندگی کا شعور حاصل ہوگیا۔ اور جناب نیّر نے اسے خوبصورت شعر میں ڈھال دیا۔

موت کو بخشا ہے جس نے زندگانی کا شعور
مر کے جو زندہ ہے وہ زندہ حقیقت ہیں حسینؑ

معصوم ششماہے علی اصغرؑ کی شہادت کربلا کی روح ہے اور رثائی ادب کی جان امام مظلوم کی صدائے استغاثہ سن کر تین دن کے بھوکے پیاسے علی

اصغرؑ کا تڑپنا، جھولے سے گرانا، خیمہ میں کہرام بپا ہونا، امام عالیمقام کا پیاسے شیرخوار کو میدان میں لاکر سوال آب کرنا، جواب میں معصوم گلے پر حرملہ کا نشانہ پھر تین پھل کا تیر کھاکر علی اصغرؑ کا مسکرانا ایسے دل افگار مناظر ہیں، جنھیں الفاظ کے پیرایہ میں ڈھالنا بہت مشکل کام ہے۔ جناب نیرؔ نے اسے کس طرح پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

راہ حق پر ہر مصیبت عین راحت ہوگئی
زخم کھاکر مسکرائے تو قیامت ہوگئی
اصغر معصومؑ تیرے خون ناحق کی قسم
سرخرو تیری شہادت سے امامت ہو گئی

یہ فطرت کا تقاضہ ہے، جو مسلسل ہمارے مشاہدہ میں رہتا ہے کہ چاہے کتنا ہی عظیم غم کیوں نہ ہو وقت گزرنے کے ساتھ مدھم ہوتا جاتا ہے، ماں باپ کے لئے اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے بڑا کوئی غم نہیں ہے مگر وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد چند آہوں اور ہلکی سی آنکھوں کی نمی تک محدود ہوجاتا ہے، صرف اور صرف یہ حسینؑ کا غم والم ہے جو بچپن سے شروع ہوتا ہے۔ جوانی میں بڑھتا ہے۔ اور ضعیفی میں بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ نیرؔ مرحوم اسے بالکل نئے انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس رثائی ترقی کو معجزہ قرار دیتے ہیں۔

ماتم شبیر ہر شام وسحر بڑھتا رہا
دن گزرتے ہی رہے غم کا اثر بڑھتا رہا
اے حسین ابن علی یہ ہے ترا اعجاز غم
عمر تو گھٹتی رہی غم عمر بھر بڑھتا رہا

کربلا کی باعظمت قربانیاں پیش کرنے کے بعد تاریخ انسانیت میں کبھی کسی مظلوم سے بیعت کا مطالبہ نہیں ہوا۔

یہ ایک ایسی حقیقت جس کی شاہد تاریخ عالم ہے۔ نیرؔ نے اس تابندہ حقیقت کو ''کردار حسینؑ'' کے مقطع میں بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔

نیر حسین ابن علی نے کیا کمال
اٹھا کبھی نہ بیعت فاسق کا پھر سوال
آزادی خیال کا حق ہوگیا بحال
خود آگہی کو منزل حق آگہی ملی

جو زباں سے کہہ دیا بدلا نہ اس کا ایک حرف
اک نہیں شبیرؑ کی قرآں کی آیت ہوگئی

مدیر ماہنامہ 'شمع ادب' معروف شاعر، معتبر و مستند صحافی، سید توکل حسین نیر سلطانپوری، جن کی شاعری تصوف، احتجاج وانقلاب کی ایک موثر ترین آواز ہے، اور ان کی ادبی صحافت اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ 'نیادور' بہت جلد نیرؔ سلطانپوری کی مجموعی ادبی خدمات پر ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کرنے جارہا ہے۔ قلمی تعاون درکار ہے۔

ہر چیز کربلا میں بڑے کام کی ملی
کربلا سے لیکر شام تک کے دلخراش مناظر کو نیرؔ نے اپنے قطعہ بند کے چوتھے مصرعہ میں سمو دیا ہے۔ جناب زینبؑ اور حضرت امام حسینؑ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

اک نبیؐ کی ہیں نواسی اک نبیؐ کے دل کا چین
ہیں علیؑ و فاطمہؑ زہرا کے دونوں نورعین
ظلم باطل میں جو گھر جائیں تو یوں پہچانئے
بے ردا گر ہوں تو زینبؑ بے کفن ہوں تو حسینؑ

رثائی ادب کا ایک خاص عنصر 'نوحہ' بھی ہے، مجھے اسوقت جناب نیر سلطانپوری کے ایک نوحے کے چند شعر میری اہلیہ نے پڑھ کر سنائے۔ یہ ہمارے بچپن میں بہت پڑھا جاتا تھا۔ بالخصوص عورتوں میں بیحد مقبول تھا اور عزادار اسے سن کر خوب گریہ و ماتم کرتے تھے، اس نوحے میں شبیہ رسولؐ حضرت علی اکبرؑ کی لاش کا خیمہ میں آنا اور پرورش کرنے والی پھوپھی زینب کے دل چھو لینے والے فریادی بین بیحد (Touching) ہیں۔ پڑھئے! ہوسکتا ہے کہ آپ کی بھی آنکھیں چھلک جائیں۔

روکر کہا زینبؑ نے ہٹ جاؤ بلا لونگی
روٹھے ہیں علی اکبرؑ میں آکے منا لونگی
میت ہے برابر کی بھائی سے نہ اٹھے گی
میں پالنے والی ہوں گودی میں اٹھا لونگی
اے بیبیو! اکبر کو دولہا تو بنا لو تم
پر خون بھرے رخ کی آکر میں بلا لونگی
کبریٰ و سکینہ سے کہہ دے کوئی جاکر یہ
سب ساتھ چلیں میرے مہندی میں لگالونگی

آخر کلام میں یہ لکھ دینا غلط نہ ہوگا کہ جناب سید توکل حسین نیرؔ سلطانپوری رثائی ادب کے بہترین سخنور تھے۔ مضمون کے اختتام پر موصوف کے چار مصرعے حاضر ہیں۔

اے حسین ابن علیؑ تیری شہادت حرف حق
کوئی غم ہوگا نہ دنیا میں ترے غم کی طرح
زندہ جاوید تو بھی اور ترا غم بھی ہے
اب کوئی ماتم نہ ہوگا تیرے ماتم کی طرح

❑❑❑

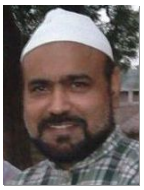

خاندان اجتہاد کی عزائی خدمات

سید مصطفیٰ حسین اسیف جائسی
مدیر ماہنامہ شعاع عمل، غفرانمآب، لکھنؤ
موبائل: 8736009814

حضرت آدم علیہ السلام نے جب سے زمین پر قدم رکھا تب ہی سے زمین پر آہ و بکا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعد ازآں جتنے بھی انبیائے کرام دنیا میں ہدایت بشر کے لئے آئے، انہیں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر عظیم قربانی و مصیبت کی طرف ضرور متوجہ کیا گیا اور انہوں نے مستقبل کی اس مصیبت پر گریہ کر کے بتایا کہ مصیبت پر گریہ بدعت نہیں بلکہ مظلوم کا تذکرہ باعث انقلاب نیز ندامت ظالمین و خاتمۂ ظالم کا سبب ہے۔ شاید اسی لئے شاعر کہتا ہے:

'نعرۂ انقلاب ہے ماتم رفتگاں نہیں'

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس اپنی کتاب ''ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ'' میں رقم طراز ہیں:

'تعزیہ داری کا وجود ہندوستان میں بہت پہلے سے تھا۔ دکن میں عاشور خانہ، سندھ میں امام بارگاہ تھی۔ شمالی ہند میں پھونس اور کپڑے کے امامباڑے محرم میں بنتے تھے۔ دس دن کے لیئے پختہ عمارت کی کیا ضرورت تھی۔ مکی نظمیں تنہا اور چند آدمی مل کے راگ سے پڑھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی سوز خوانی اسی کی یادگار ہے، اس سے بجز حصول ثواب اور کوئی افادیت نہ تھی۔ وہ بھی جب کہ حدود شرع میں ہو، جلوس بھی نکلتے تھے جن میں شہنائی، روشن چوکی، طبل، تاشہ، جھانجھ بجتے اور ماہی مراتب (مچھلی اور چوپاؤں کے سر چاندی او رپیتل کے بانسوں پر لگے ہوئے) کے ساتھ براق اور گنبد تعزیوں کی جگہ ہوتے تھے، کچھ کچھ دور پر ٹھہر ٹھہر کے بانک اور پٹے کا فن دکھاتے اور یا حسینؑ کی آواز بلند کرتے۔ ان رواسم کی بجا آوری میں سب مسلمان یکساں طور پر شریک تھے۔'

غفرانمآبؒ نے روشن چوکی اور شہنشائی کو آلات غنا ہونے کی وجہ سے حرام اور طبل کو جنگی باجہ ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا، جھنڈیوں، ماہی مراتب کے بدلے علم، گنبد کی جگہ تعزیے اور بانک اور پٹے کا فن دکھانے کے بجائے سینہ زنی اور حسینؑ حسینؑ کو رواج دیا۔

حاضری، مہندی اور نذر و نیاز ایسے رواسم قائم کئے، محرم کے دس دن میں ہر دن ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کیا۔ مجلسوں میں عراق کی روضہ خوانی کے طرز پر ذاکری شروع کی۔ جس میں اہلبیت علیہم السلام کے فضائل میں حدیثیں بھی مصائب کے ساتھ بیان کی جانے لگیں۔ اس طرح مجلس کی افادیت بڑھ گئی اور اس میں تبلیغی پہلو پیدا ہو گیا۔ اور ان رواسم کو اتنا عام کر دیا کہ گھر گھر مجلس اور گلی گلی تعزیئے اٹھنے لگے۔ اس طرح انہوں نے شیعوں کی تعزیہ داری کو، ایک نئی شکل دے کر عام مسلمانوں سے علیٰحدہ کر دیا۔ اور اس سے مذہبی تبلیغ، قومی تنظیم اور شیعی تمدن کی تشکیل کی۔

اس سلسلہ میں ایک کمی جو عراق و ایران میں ہے انہوں نے یہاں اس کو پورا کیا۔ عراق و ایران کے علماء مجلسیں پڑھنا اپنی شان اور مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکری جسے وہاں روضہ خوانی کہتے ہیں کم پڑھے لکھے لوگوں کا کام رہ گیا۔ اور اس میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ ہندوستان میں مجلسوں میں مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ انکا خیال تھا کہ مجلس شاعرانہ کمال دکھانے کی جگہ نہیں ہے اس میں فضائل و مصائب اہلبیت بیان ہونا چاہئیں۔ انہوں نے واقعات کربلا پر معتبر روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ ''اثارۃ الاحزان'' کے نام سے پیش کیا۔ اور عاشورا کے دن عصر کے بعد خود مجلس پڑھنے کی ابتدا کی، اس طرح ہندوستان کے علماء میں انہوں نے یہ سنت قائم کی کہ ان کے بعد ان کے جانشین یہ مجلس پڑھتے رہے۔ آج بھی یہ مجلس اسی وقت ان کے امامباڑے میں ہوتی ہے۔ اب یہاں کے علماء کو جو حقیقت میں انہیں کی ذریات تھے، اس پر اعتراض اور اس سے احتراز کی کیا ہمت ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کثرت سے علماء مجلسیں پڑھنے لگے۔''

حضرت غفرانمآبؒ نے غلط رسوم کو مٹا کر عزائے سید الشہداء علیہ السلام کو شرعی نظام کے ساتھ فروغ دیا۔ ساتھ ہی اکثر امامباڑوں سے پہلے اپنے ہاتھ سے عزاخانۂ حسینی کا سنگ بنیاد نصب کیا۔ اور پہلے پہل مجالس بنا کیئے بلکہ حضرت سلطان العلماء رضوان مآبؒ کو اجازۂ اجتہاد و وصیت نامہ میں عزاداری میں منہمک رہنے کی وصیت بھی فرمائی ہے۔ (ترجمہ عربی عبارت) ''یعنی اے فرزند! میں تمہیں جناب سید الشہداء خامس آل عبا سبط رسول الثقلین حضرت امام حسینؑ کی مصیبت جانگزا پر رونے، پیٹنے کی وصیت کرتا ہوں خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ ان کے سر قلم کئے گئے،

ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ذبح کئے گئے۔ان کے حرم محترم قید کئے گئے اور کوچہ و بازار میں ان کی توہین کی گئی۔''

قدسیؔ جائسی فرماتے ہیں کہ

تیرا جلوہ ڈھونڈتی تھی ہند کی تیرہ فضا
ہند کا تاریک مطلع تو نے روشن کردیا
تونے فرمائی حسینی انجمن آراستہ
تو ہوا بانی عزائے سید مظلوم کا
بن گیا تو خودشہید کربلا کا سوگوار
روشن اس عالم میں کی شمع عزا صد مرحبا
اہل ایماں کو رلایا صورت ابر بہار
جب حسینی کارنامہ تھا جہاں بھولا ہوا
کربلا کا واقعہ اک قصۂ پارینہ تھا
تونے سمجھی قدر خون حق نا معصوم کی
فدیۂ حق سبط پیغمبر حسینؑ ابن علیؑ
لوگ اسرار شہادت سے بھی تھے ناآشنا
تونے ترویج عزائے سید مظلوم کی
از سر نو جس نے بخشی دین حق کو زندگی
ہند والوں کی نظر میں اس کی وقعت کچھ نہ تھی
معرفت کی شمع تو نے انجمن افروز کی

ساحرؔ لکھنوی کہتے ہیں:

اسی طرح سے یہ مظلوم کی عزاداری
انہیں کے دم سے یہاں ہر طرف ہوئی جاری
عزا تھی قوم کے حق میں جو وجہ بیداری
جلائی آتش غم کی دلوں میں چنگاری
قلم علم کیا پیغام کربلا کے لئے
امامباڑے بنائے صف عزا کے لئے
یہ لکھنؤ جو بنا مرکز علوم و عزا
شرف اسے یہ خدا کے کرم سے ہاتھ آیا
کہ خوشہ چیں ہوا بر صغیر کل اس کا
ہو فیض آباد کہ دلی، دکن کہ امروہہ
یہیں سے دین کی دولت سبھوں نے پائی ہے
اسی کے علم میں شاگرد کل خدائی ہے

حضرت غفرانمآبؒ نے ۱۲۰۰ھ سے لکھنؤ کو مرکز بنا کر تمام ہندوستان میں جس طرح شیعیت کی تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیا اسی طرح عزاداری کی ترویج اور اس کی تاثیر وافادیت میں اضافہ کو اپنا نقطۂ نگاہ قرار دیا۔ اس کے لئے آپ نے ایک عزاخانہ اپنے وطن نصیرآباد میں بنوایا اور پھر دوسرا عزاخانہ ۱۲۲۷ھ میں لکھنؤ میں بنوایا جس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر فرمائی۔

شمسؔ لکھنوی لکھتے ہیں کہ ''غفرانمآبؒ نے مجلسوں کے انعقاد پر زور دیا خود بھی امامباڑہ بنوایا اور اس کو سامان آرایش سے بھرنے کے بجائے مجلسوں کا اہتمام کیا اور حدیث خوانی پر زیادہ توجہ کی۔''

قدسیؔ مرحوم فرماتے ہیں کہ

تجھ کو تھی اک خاص ارادت حضرت شبیرؑ سے
کشتۂ تیر و سنان و نیزہ و شمشیر سے
سید خونیں کفن سے سرور دلگیر سے
فاطمہؑ زہرا کے ماہ کامل التنویر سے
آیت عشق حسینی ہے حسینیہ ترا
مرکز جذب حقیقی ہے حسینیہ ترا

حسینیۂ غفرانمآبؒ کی تعمیر اور مجالس کو تقریباً دو سو سال پورے ہونے کو ہیں اس کے پہلے ذاکر خود غفرانمآب ہیں اور دوسرے ذاکر آپ کے فرزند اکبر ہیں جو اودھ میں حکومت شرعیہ کے مؤسس بھی ہیں اور جنہوں نے دینداری و عزاداری کو مزید فروغ دیا۔ سلطان العلماء نوراللہ مرقدہ عصر عاشور کو منبر پر سربرہنہ تشریف لے جا کر تذکرۂ مصائب فرماتے تھے جن کے چند جملے مجلس میں کہرام برپا کردیتے تھے۔سلطان العلماء کے بعد ملک العلماء مغفرت مآبؒ نے یہ سنت قائم رکھی بعدہ ملاذ العلماء مولانا سید ابوالحسن عرف بچھن صاحب قبلہ اس عصر کی مجلس کو اپنے انتہائی مؤثر انداز میں پڑھتے رہے اور پھر بحر العلوم مولانا سید محمد حسین عرف علن صاحب قبلہ تو ایک مجتہدانہ رنگ ذاکری کے بانی ہوئے جن کے بعد سے وہ تفریق جوعلماء و ذاکرین کی تھی، بہت حد تک ختم ہوگئی۔مولانا شمسؔ لکھتے ہیں کہ ''بحر العلوم نے ذاکری کے فن میں انقلاب پیدا کیا۔حدیث وتفسیر اور فلسفیانہ موشگافیوں سے تقریر کو علمی بنا کر موجودہ طرز ذاکری کے موجد ہوئے۔'' بحر العلوم کے ایجاد کردہ طرز ذاکری کو خاندان اجتہاد سے متعلق ذاکر، خطیب اعظم علامہ سید سبط حسن نقوی فاطرؔ جائسی نے آسمان پر پہنچا دیا۔اور خطیب اعظم کے عہد شباب ذاکری ہی میں ''ذاکر شام غریباں'' کے لقب سے ملقب عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین نقوی مجتہد نے ذاکری شروع کی۔اور کچھ ہی عرصہ میں عالمگیر شہرت کے مالک ذاکر ہوگئے۔عمدۃ العلماء نے تقریباً ساٹھ سال ذکر فضائل و مصائب اہلبیتؑ بیان فرمائے اور ۱۹۲۶ء سے تاحیات دنیا بھر میں سنی جانے والی مجلس شام غریباں پڑھی۔حیات اللہ انصاری کا بیان ہے کہ ''انہیں الفاظ کے پیکر سجانے کے ساتھ ان کو جذبات کی روح عطا کرنے کا بھی سلیقہ تھا۔

''حسینیۂ غفرانمآبؒ کے خصوصی ذاکر عمدۃ العلماء کا ذکر، تذکرۂ خاندان اجتہاد کے درمیان اپنے مرثیے ''فقہ و شمشیر'' میں ساحرؔ اجتہادی یوں فرماتے ہیں:

اس گلستاں کے سبھی گل تھے شگفتہ شاداب
حضرت کلب حسین آپ مگر اپنا جواب
منبر علم کی زینت تو وقار محراب
جنکی پیری تھی زلیخائے خطابت کا شباب
مطلع علم پہ جب وہ قمرآرا چمکا
صبح اقبال فصاحت کا ستارہ چمکا

صاحب مطلع انوار تحریر فرماتے ہیں کہ ''مولانا کلب حسین صاحب کو خدا نے قوت بیان اور ملکۂ خطابت مرحمت فرمایا تھا اس لئے منبر کو زینت بخشی اور دن بہ دن ترقی کرتے گئے۔مطالعہ اور محنت سے اپنے بزرگوں کے سامنے شہرت اور ناموری کے مدارج عالیہ طے کئے۔ ہر انجمن انہیں اپنا سرپرست جانتی

تھی۔ برصغیر کے ہر گوشہ تک ان کی آواز پہنچتی تھی۔ شیعہ ایجیٹیشن میں ان کی قیادت اور سنی شیعہ اسٹیج پر ان کی تقریر، شیعوں کی زعامت اور سنیوں سے اتحاد انکی شخصیت کا روشن پہلو ہے۔ ان صفات نے انہیں حیرت انگیز محبوبیت بخشی تھی۔ جناب نجم الملۃ اور ناصر الملۃ کے بعد مرجعیت میں ان کی ذات منفرد ہوگئی تھی۔ ان کی سب سے بڑی مصروفیت مجلسیں تھیں۔ وہ برصغیر کے گوشے گوشے میں پہونچے مگر جمعہ کے دن آصف الدولہ کی مسجد میں نماز بہرحال ادا کی۔ محرم میں عشرۂ مجالس کی گنتی دشوار ہے لیکن غفرانمآبؒ کے امامباڑے اور چھوٹی رانی کے عزاخانۂ اقبال منزل کی مجلسیں یادگار تھیں۔ خطابت میں ان کا اسلوب بہت دلکش تھا۔ ان کا لہجہ نرم، انداز بیان سادہ، زبان فصیح وشیریں، مطالب لطیف و عام فہم و عالمانہ، کوثر کی روانی، سلسبیل کا بہاؤ، منبر کا وقار اور آواز کا دھیما پن، نہ چیخ نہ پکار، نہ دبی ہوئی صدا، ہزاروں کا مجمع مگر دور دور تک آواز پہنچ رہی ہے۔ آواز کے ساتھ سامعین کا حضور ذہن، درود و داد، گریہ و فریاد، جب چاہا رلا دیا پھر مصائب میں تصنع نہ فضائل میں شور۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر کی سطح پر ہوا کے جھونکے ہلکا ہلکا تموج پیدا کر رہے ہیں۔''

خطیب اعظم کے عہد میں خاندان اجتہاد کے ایک اور عظیم محقق یعنی حکیم الامت علامۂ ہندی سید احمد نقوی مجتہد بھی اپنے علم و فن خطابت سے زمانہ کو مستفید فرما رہے تھے اور کچھ عرصے کے بعد تو سید العلماء علامہ سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ نے تو کمال احتیاط و تحقیق سے ذاکری کو معراج ہی عطا کر دی۔

علامہ سید سعید اختر گوپالپوری ''خورشید خاور'' میں رقمزن ہیں کہ ''سید العلماء کی خطابت کا ایک خاص رنگ تھا۔ جو عبارت آرائی اور سستی نکتہ آفرینی کے بجائے علم اور تحقیق پر مبنی تھا اور ایک گھنٹے کی مجلس میں حقائق و معارف کے کتنے دروازے وا ہو جاتے تھے۔ ان کی تقریر و تحریر میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ دوسری خاص بات ان کی تقریروں میں یہ تھی کہ ہر مذہب وملت کا ماننے والا اسے اطمینان قلب کے ساتھ سن سکتا تھا اور فیضیاب ہو سکتا تھا۔ کسی جملے سے کسی کی دل آزاری کا خطرہ نہیں تھا۔''

ساحرؔ اجتہادی اپنے مرثیہ ''علم اور علماء'' میں فرماتے ہیں:

جناب مولوی سید علی نقی، جیسا
بہت ہی کم کوئی عالم یہاں ہوا ہوگا
وہ اہل علم کی نظروں میں سید العلماء
وہ اہل حق کے لئے آیۃ اللہ العظمیٰ
حسینیت میں وہ اک فکر نو کے بانی تھے
جہان علم میں اللہ کی نشانی تھے
خطابت ایسی کہ اغیار بھی مقر ہوں کہ ہاں
نظر عمیق، مضامیں دقیق، بات آساں
فضائل ایسے کہ ایمان ہو دلوں میں جواں
دلائل ایسے کہ تائید کو بڑھے قرآں
زبان وہ کہ فصاحت نثار ہو جائے
مصائب ایسے کہ دل بیقرار ہو جائے

اور اسی دور تحقیق و تبلیغ میں ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء کے دو فرزندوں یعنی آقائے شریعت صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی امام جمعہ لکھنؤ طاب ثراہ اور مفکر اسلام دکتر مولانا سید کلب صادق صاحب قبلہ نے بھی تبلیغ دین کے ساتھ نشر و ترویج عزا کی خدمت کے لئے ذاکری کا سہارا لیا اور حد ہے کہ صفوۃ العلماء نے کار عزا ہی میں شربت شہادت بھی نوش فرمالیا۔

ساحرؔ لکھنوی فرماتے ہیں:

اسی سورج کا اجالا اسی مہتاب کا نور
کلب عابد سا وہ خوش خلق و خوش اطوار و غیور
پیکر علم و عمل، صدق و صفا، فہم و شعور
خدمت شرع سے آقائے شریعت مشہور
منبر علم پہ رتبہ تھا دوبالا ان کا
تھا سر شام غریباں بھی اجالا ان کا
منبر علم تھا ان کو جو تجلی گہہ طور
رفعتیں ان کی قدم بوس تھیں حسب دستور
عظمتیں ساتھ تھیں کہتی ہوئی سرکار حضور
اس پہ نخوت تھی نہ غرہ نہ تکبر نہ غرور
بڑھ کے چلتے تھے تو اک رہبر عالی کی طرح
جھک کے ملتے تھے تو پھولوں بھری ڈالی کی طرح

خدا کا شکر ہے کہ آج بھی ہندو پاک میں علماء وخطباء خاندان اجتہاد ''خالق کی توحید اور خلائق کے اتحاد'' کے تحت خدمت دین خدا و تبلیغ عزائے سید الشہداءؑ میں مصروف ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک مصروف رہیں گے۔ آقائے شریعت کے بعد سے تعلیمات اسلامیہ کے عظیم مرکز حسینیۂ حضرت غفرانمآبؒ میں قائد ملت جعفریہ مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب (امام جمعہ لکھنؤ) عشرۂ مجالس اور اسی عزاخانہ کی ایجاد شدہ مجلس شام غریباں کو خطاب فرما رہے ہیں اور ایمان افروز و نفاق شکن بیانات سے مومنین کرام مستفیض ہو رہے ہیں۔ اس سال موصوف نے علماء و خطباء سے خواہش کی ہے وہ اپنی تقریروں سے اتحاد بین المسلمین کو تقویت پہنچائیں۔

عزائے امام حسین علیہ السلام اتحاد بین المسلمین ہی نہیں بلکہ اتحاد نوع بشر کا سب سے بڑا اور مفید ذریعہ ہے۔ شاعر اہلبیت حضرت نجمؔ آفندی طاب ثراہ فرماتے ہیں:

ملت کے تفرقہ کا نہ سامان کیجئے
قرآن کے ورق نہ پریشان کیجئے
جاں دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے
پورا شہید ظلم کا ارمان کیجئے
سرکار دوجہاں کی محبت کے نام پر
آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے
مرکز بنا کے آج حسینی نشان کو
دنیا میں اتحاد کا اعلان کیجئے

❑❑❑

بہار میں اردو مرثیہ کا تاریخ ساز سفر: ایک تجزیہ

ڈاکٹر محمد ارمان
کاشی ناتھ کالونی، کٹاری ہل روڈ، گیا (بہار)
موبائل: 9931441623

مرثیہ مشرقی ادب اور خصوصاً اردو ادب کی ایک مشہور زمانہ شعری صنف ہے۔ ''زندوں کی تعریف قصیدہ اور مردوں کی تعریف مرثیہ'' والی بات اگر چہ غلط نہیں، مگر وہ عربی شاعری کے حوالے سے بس تاریخ کے ایک دور ہی تک محدود کہی جا سکتی ہے، کیوں کہ واقعہ کربلا کے بعد جب شعرائے ایران کی نگاہیں اس حادثہ فاجعہ پر مرکوز ہوگئیں تو لامحالہ ''مرثیہ'' کا مفہوم بھی بدل گیا اور اسی حوالے سے یہ ہماری زبان میں بھی رواج عام پا گئی، یہاں تک کہ آج اردو میں مراثی کربلا کے اکتسابات ہی کیا، بجائے خود اردو مرثیہ کی تاریخ و تنقید پر متعدد معتبر کتابیں موجود ہیں۔ اگر ''اردو مرثیہ''، ''اردو مرثیہ کی روایت'' اور ''اردو مرثیہ کا ارتقا'' کے نام سے بالترتیب سفارش حسین رضوی اور ڈاکٹر مسیح الزماں کی کتابیں ملتی ہیں اور ''دکن میں اردو مرثیہ کا ارتقا'' اور ''دکن میں مرثیہ نگاری'' کے نام سے بالترتیب عبدالقادری سروری اور ڈاکٹر رشید موسوی کی تصنیفات حاضر ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ''اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقا'' اور ''بہار میں اردو مرثیہ'' کے نام سے بالترتیب ڈاکٹر اکبر حیدری اور پروفیسر افضل حسین کی کتابیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں، مزید برآں ''مرثیہ انیس و دبیر'' اور ''المیزان'' کی صورت میں ڈاکٹر حسین فاروقی اور ڈاکٹر احسن فاروقی کی کتابیں بھی موجود ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ سرحد پار کی مرثیہ نگاری پر ضمیر اختر نقوی کی کتاب ''پاکستان میں اردو مرثیہ''، ''جدید فن مرثیہ نگاری'' پر وحید الحسن ہاشمی کی کتاب اور مجتبیٰ حسین کا بسیط مقالہ نیز ''جدید اردو مرثیہ'' کے نام سے محمد رضا کاظمی کی تصنیف بھی منظر عام پر آ چکی ہے اور مزید یہ کہ بیشتر مذکورہ کتابوں پر ڈاکٹر غلام رسول ساجد نے اپنی تصنیف ''اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ'' میں اور متعدد ناقدین فن نے اپنے اپنے مقالات میں سیر حاصل تجزیاتی و علمی تبصرہ بھی پیش کیا ہے، یہاں تک کہ شاہ ظہور، شاد عظیم آبادی اور جمیل مظہری جیسے مرثیہ نگار ان بہار پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور بحیثیت مجموعی مذکورہ علمی کتابوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں جہاں مرثیہ نگاری کے فکری و فنی ارتقا پر مختلف پہلوؤں سے بحث ہوئی ہے، وہیں اس بات کا بھی اعتراف ہوتا رہا ہے کہ بہار میں اردو مرثیہ کی تاریخ قدیم و عظیم ہی نہیں بلکہ وہ جدید مرثیہ کے فکری و فنی تناظر میں بہت ہی خاص انفرادیات، اولیات اور افادات و اضافات کی حامل بھی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہار باکمالوں کی دھرتی ہے اور بلاشبہ مرثیہ کی تاریخ پر بھی ان باکمالوں کا فیضان ہمیشہ ہی ارزاں رہا ہے اور خصوصیت کے ساتھ صوفیائے بہار نے اس صنف کی آبیاری میں تاریخ ساز حصہ لیا ہے۔ اگر صرف اختر اورینوی کی ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' جیسی کتاب ہی سامنے رکھ لی جائے تو بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس میں عماد الدین قلندر، خواجہ نقشبند سجاد، رکن الدین عشق اور غلام یحییٰ حضور غرض کہ جن اکابر صوفیوں کا ذکر آیا ہے ان سبھوں کے یہاں مرثیہ سے وافر شغف کے شواہد موجود ہیں اور یقیناً بہار میں اردو مرثیہ کی تاریخ کے حوالے سے مذکورہ بزرگوں کے رثائی کلام پر مستزاد، فغاں و ثروت، جوشش، شاہ امان ترقی، ابوالحسن فرد، ظہور الحق ظہور، شیخ غلام علی راسخ اور آیت اللہ جوہری کی باقیات بھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔

بلاشبہ بہار کا یہ امتیاز ہے کہ یہاں سجادگان طریقت اپنی مسلسل توجہ سے ابتدائی مراثی کے خدوخال تمام تر ممکنہ فکری و فنی شعور کے ساتھ تادیر نکھارتے رہے اور اس شان سے نکھارتے رہے کہ اس نے ایک مستقل دبستان کی حیثیت سے اپنی دائمی شناخت قائم کر لی۔ بہار کے ابتدائی مرثیہ نگاروں کے یہاں مقامی الفاظ اور ہندی لب ولہجہ بہر صورت نمایاں ہے، یہاں مثالوں کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن اتنی بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ تپاں کے کلام رثائی میں زبان ولہجہ کا جو حسن ہے اور شاہ ظہور کے یہاں مگہی بھاشا کی جو شان اور جیسا مقامی رنگ و آہنگ ہے وہ بہر حال یہ بتا دیتا ہے کہ بہار میں مرثیہ نگاری کا سفر بہت ہی خاص اور تاریخ ساز شان و شوکت کے ساتھ آغاز پایا اور آگے بڑھتا رہا۔

بہار میں اردو مرثیہ کی تاریخ کے لئے اگر ہم شاد و صفیر کے دور کو ''حرف عطف'' کے مصداق قرار دیں تو شاید غلط نہ ہوگا، کیوں کہ جس طرح شاہ آیت اللہ جوہری سے بہار میں مرثیہ نگاری کی باقاعدہ شروعات ہوتی ہے، اسی طرح ان دونوں بزرگوں کے زمانے سے ہی قدیم و جدید میں وہ حد فاصل اُبھرنے لگتی ہے جو جمیل مظہری تک پہونچ کر پوری طرح واضح ہو جاتی

ہے۔حضرت شادؔ، دبیرؔ کے شاگرد، انیسؔ کے مداح اور مرزا اوجؔ کے استاد بھائی تھے۔ اتنا ہی نہیں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ شادؔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے عزیز بھی تھے اس کا اضافی اثر یہ ہوا کہ شادؔ نے علی گڈھ تحریک کی حد سے سوا مدد ہی نہیں بلکہ نظم میں اپنے لئے جو اسلوب بنایا وہ ان کی مرثیہ نگاری کا اسلوب بھی بن گیا اور اس طرح انیسؔ کے کلام پر بازدید کی کاوش میں کامیابی ،گویا شادؔ کا، یا یوں کہیں کہ بہار میں مرثیہ نگاری کی ارتقائی تاریخ کا حصہ بنی جو بجائے خود ایک بات نہیں، بہت بڑی بات ہے۔

شادؔ نے صبر و استقلال کے مناظر میں جو کچھ جدت پیدا کی ہے اور ذوق فلسفہ سے آزاد رہ کر جس طرح فطری انداز کو اپنے رثائی کلام میں درآنے کا موقع دیا ہے، مزید برآں شہادت اور اظہار مقاصد کے مناظر میں جس طرح انہیں کامیابی ملی ہے وہ یقینا بہار کے حوالے سے اردو مرثیہ کے تاریخ ساز سفر کی گواہی کے لئے کافی ہے۔ آج جب ہم جدید مرثیہ کی بات کرتے ہیں اور محمد رضا کاظمی کے لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ ''پہلے مرثیہ گو رُلا کر اپنی آخرت سنوارتا تھا اور اب جگا کر پوری ملت کی دنیا و آخرت کو سنوارنا چاہتا ہے'' تو پھر ہمیں بانگ دہل یہ بھی کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اس بدلے ہوئے منظر نامے کے لئے جس شاعر کا اسلوب ایک پیش خیمہ ثابت ہوا اس کا تعلق بہار ہی سے ہے۔

شادؔ کے بارے میں جس طرح کہا جاتا ہے کہ انہوں نے غزل کے حوالے سے دہلی اور لکھنو کی خلیج پاٹ دی اسی طرح یہ بھی کہنا غلط نہیں کہ انہوں نے اپنی فکر اور اپنے اسلوب سے مرثیہ کے باب میں لکھنو اور عظیم آباد کے تاریخی ربط کو مستقبل کے لئے کچھ اس طرح بارآور ہونے کی راہ کھول دی کہ اس کے اعتراف سے مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اگر یہ ایک حقیقت ہے کہ صفیرؔ و شادؔ کے یہاں طویل مراثی ملتے ہیں، واقعہ نگاری کا اہتمام ہے اور تصوف و فلسفہ اور مناظر فطرت کی پیش کش میں خاص ہنرمندی دکھائی دیتی ہے۔ اگر یہ کہنا روا ہے کہ ان بزرگوں نے اخلاقی تعلیم اور صبر و شکر کے مضامین خوب سے خوب تر نظم کئے ہیں اور مراثی کے چہرے کو بے پناہ تنوع بخشا ہے تو پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ خصوصیت کے ساتھ شادؔ عظیم آبادی نے جو کچھ کہا ہے وہ فن کے باب میں وقت کی ایک بڑی ادبی تحریک سے شعوری غذا یافتگی کے ساتھ ہی کہا ہے اور یہ غذا وہی حالیؔ کا پیغام بیداری اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر آنے والے نظمیہ طریق فن سے مرثیہ گوئی میں اسلوبیاتی استفادہ ہے۔

بلاشبہ شادؔ نے اردو مراثی میں جو اہتمام کیا ہے، وہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ وہ محض تخلیقی نہیں، تنقیدی بھی ہے اور اس کا سب سے واضح اثر یہی ہے کہ اس کی بدولت مرثیہ کے لئے بہار کو ایک خاص دبستان کا مرتبہ ملا اور انیسیت و دبیریت میں سے کوئی ایک مرکز ثقل، مجموعی توازن سے محروم نہیں رہا۔

مسدس حالی کے بارے میں سرسید کی تاثراتی رائے سے زمانہ واقف ہے اور اسی طرز پر شاید یہ کہا جائے تو بیجا نہیں کہ شادؔ بھی روزِ اجر آخری سوال کے جواب میں یہ کہنے کا حق رکھتے ہوں گے کہ وہ مرثیہ کے لئے اس انداز فکر و فن کی داغ بیل ڈال آئے جسے جمیلؔ مظہری نے اپنے وقت میں مثالی عروج تک پہونچا دیا۔ مرثیہ کو نہایت لطافت ہنر کے ساتھ عقلیت پسندی کی ادبی تحریک سے غذا یافتہ بنانا اگر شادؔ کا کمال ہے تو کہنا چاہیے کہ اُسے ترقی پسندی کی ادبی تحریک سے غذا یافتہ بنا دینا جمیلؔ مظہری کا حصہ ہے۔ گویا اردو کی دو بڑی تحریکوں کے حوالے سے اردو مرثیے کا تاریخی سفر بہرصورت بہار کے فنکاروں کا مرہون منت ہے۔

جمیل مظہری نے تحریک آزادی کا جو زمانہ پایا اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اردو مراثی کو اقلیتی سیاست کا آئینہ دار بنانا یا یوں کہا جائے کہ ''پیمان وفا'' کی صورت میں مرثیے کا رشتہ قومی شاعری سے جوڑنا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ مرثیہ اگر رزمیہ شاعری ہے تو پھر کہنا چاہیے کہ اس کی شان حماسہ سرائی کو جمیلؔ مظہری نے جس طرح وقت کی آواز سے ہم آہنگ کر دیا، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ہمیں فی الوقت اگرچہ اس بحث کی طرف جانا مقصود نہیں ہے کہ جوشؔ کے ''آوازہ حق'' سے جمیلؔ مظہری نے کہاں تک فائدہ اٹھایا، مگر اس کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کسی تامل کا احساس بھی نہیں ہو رہا ہے کہ جمیلؔ نے دبیرؔ کی بنیادی صفات کا تا حد امکان پاس رکھا اور تشکیک و ترقی پسندی کے رجحانات لے کر مرثیہ کی دنیا میں آئے اور کربلا کے سیاسی و عمرانی اور مذہبی و روحانی عوامل سے بیش از بیش انصاف میں انہیں کامرانی ملی۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

> ''بیسویں صدی میں فکری اعتبار سے جدید مرثیہ کی سب سے بڑی اور سب سے سنجیدہ آواز علامہ جمیلؔ مظہری کی ہے۔''
>
> (جمیلؔ مظہری کے مرثیے، حلقہ فکر و نظر، کراچی، ص ۵)

اور یہاں ان سطروں پر ہمیں اس توضیحی اضافے کی اجازت دی جائے کہ جمیلؔ مظہری کے مراثی کا تاریخی ہونا اس لحاظ سے بھی خالی از اختصاص نہیں کہ اس کے زیر اثر بہار میں اردو مرثیہ کا سفر، تاریخ ساز خطوط پر آگے بڑھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جمیلؔ مظہری کے بعد اردو مرثیہ کا جو کارواں نظر آتا ہے، اس میں زارؔ عظیم آبادی، سید علی اکبر کاظمی، احسنؔ داناپوری، نتھونی لال وحشیؔ مظفر پوری، مرتضیٰ اظہرؔ، ہوشؔ عظیم آبادی، وفاؔ ملک پوری، شہزاد معصومی، نقی احمد ارشادؔ اور صباؔ نقوی جیسے اساطین فن شامل ہیں اور بحیثیت مجموعی ہم دیکھتے ہیں کہ ان بزرگوں نے معرکتہ الآرا خیالات، نہایت محکم حربیہ عناصر اور کہیں روایتی انداز اور کہیں واقعہ نگاری پر زور دینے کے مزاج سے کام لیتے ہوئے بصد حسن و اہتمام اردو مرثیہ کی تاریخ کو اکیسویں صدی کے ربع حاضر تک پہنچا دیا ہے۔

❑❑❑

طارق قمر
نیوز ۱۸، ای ٹی وی اردو، لکھنؤ
موبائل: 9335915058

حسینیت تو ہماری رگوں میں دوڑتی ہے

حسینی برہمن، معتقد اہل بیت سنیتا جھنگرن سے ڈاکٹر طارق قمر کی خاص گفتگو

سوال

سنیتا جھنگرن صاحبہ آپ کا شمار نہ صرف لکھنؤ اور اتر پردیش کے بلکہ ملک کے ممتاز گلوکاروں میں کیا جاتا ہے بالخصوص رثائی ادب کی اصناف وفنون کے تعلق سے صاحبانِ علم اور اہل ذوق آپ کو یکتا ومنفرد قرار دیتے ہیں۔ کیا فرمانا چاہیں گی اس مقام کے تعین اور اس نظریے کی تائید کے پس منظر میں۔

جواب

طارق صاحب! مولیٰ کی جو گن کہتے ہیں لوگ مجھے.....اور یہ ہی میرے لئے دنیا کا سب سے بڑا اعزاز بھی ہے اور ایسا لقب بھی جس پر میں فخر کرسکتی ہوں۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں یہ میرے مولیٰ کا کرم ہے یہ حسینؑ کی مدحت کا انعام ہے ثانیٔ زہراؑ کے در کی گدائی کا اکرام ہے۔۔ میری جھولی میں محبت اہل بیت نے وہ سب کچھ ڈال دیا جس پر مجھے ناز ہے فخر ہے مولیٰ کی اس جوگن نے اپنی آنکھوں کا ایک ایک آنسو اہل بیت کی نذر کیا ہے اور آج بھی حسینؑ کی یہ عقیدت مند زینبؑ کی یہ عزادار سکینہ کی طرفدار حضرت عباس کی علمدار اور سکینہ وبانو کی غمخوار یہی دعا کرتی ہے کہ جب تک آنکھوں کی بینائی باقی رہے اہل بیت کے نام پر اشکوں کی رسائی کا سفر جاری رہے کیونکہ اہل بہت کا غم مولیٰ کی اس جوگن اور زینب کے در کی بھکارن کے لئے دولتِ کائنات سے کہیں بہتر اور افضل ہے یہ غم میرے فن کو جلا دیتا ہے مجھے منفی طاقتوں سے لڑنے کا حوصلہ دیتا ہے زندگی کی مشکل راہوں میں رہنمائی کرتا ہے اور رنج والم کے اسی سوز کی وجہ سے مجھے وہ منصب ومقام ملا ہے جس کا ذکر آپ نے کیا۔ میں کسی لائق نہیں یہ سب صدقۂ کربلا ہے۔ مولیٰ کی عطا ہے۔

سوال

سنیتا جی کسی بھی فنکار کی ترقی کامیابی وکامرانی میں اس کی اپنی ذاتی کوششوں اور صلاحیتوں کے ساتھ وراثت کا بھی اہم رول ہوا کرتا ہے۔ آپ سے جاننا چاہتے ہیں کہ اس ضمن میں آپ کی وراثت کس حد تک کارفرما ہے اور فن موسیقی کی تربیت اور اہل بیت کی عقیدت کی امتزاج میں وراثت کا کیا دخل ہے۔

جواب

یہ سوال میرے لئے بہت اہم ہے اور وہ اس لئے کہ اس سے میری زندگی کے کئی گوشوں کا احاطہ ممکن ہے۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے تو میں عرض کردو کہ اس حوالے سے میں خود کو بہت خوش نصیب تصور کرتی ہوں اور میرا سلسلہ سوامی ہری داس جی سے ہوتا ہوا اس عظیم فنکار تک پہنچتا ہے جسے دنیا تان سین کے نام سے جانتی ہے اور پھر اہم پہلو یہ کہ میں موسیقی کی دنیا کی اس عظیم گلوکارہ فنکارہ کی شاگرد ہوں جسے لوگ بیگم اختر کہتے ہیں.....اور یہاں یہ بھی عرض کردینا چاہتی ہوں کہ موسیقی کی دنیا میں جو کچھ بھی عزت وشہرت ملی اس پر کبھی اتنا فخر نہیں ہوا جتنا فخر اس وقت محسوس ہوا جب اہل نظر نے مجھے جا نشین بیگم اختر کہا مجھے ان کی صحیح اور حقیقی شاگردہ تسلیم کیا۔ اب رہا آپ کے سوال کا دوسرا رخ تو میں یہ واضح کردوں کہ محبت اہل بیت بھی مجھے وراثت میں ملی ہے میں ایک حسینی براہمن ہوں محبت حسینؑ میری رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے میرے بزرگوں کی رگوں میں ان رشی منیوں کا خون گردش کررہا تھا جن کا وجود ہی عطاء کربلا ہے اور کئی صدیوں سے یا حسینؑ لبیک یا حسینؑ کے نعرے بلند کرتا ہوا یہی خون کبھی میری صدا میں ڈھل جاتا ہے کبھی اشک عزا میں بدل جاتا ہے۔

سوال

سنیتا صاحبہ! آپ نے موسیقی کی مختلف جہتوں میں سفر کیا۔ رموز ونکات سے آشنائی حاصل کی۔ مختلف اصناف کی پیش کش میں غیر معمولی مثالیں قائم کیں نہ مٹنے والے نقش مرتسم کئے۔ بات چاہے غزل سرائی کی ہو، دادرے کی ٹھمری کی یا دیگر فنون واصناف کی آپ ہر میدان میں منفرد نظر آتی ہیں لیکن اعلیٰ وارفع ذوق رکھنے والا طبقہ اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ جب آپ سوز وسلام پیش کرتی ہیں نوحہ و مرثیہ پڑھتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیبی طاقت ہے جس نے ان اصناف کی پیش کش کے لئے آپ کو منتخب کرلیا ہے۔

جواب

ہائے ہائے ہائے! جیتے رہئے! سلامت رہئے! عطائے اہل بیت سے فیضیاب ہو جایئے! سچ تو یہی ہے طارق میاں کہ میں جب جب اہل بیت کو یاد کرتی

ہوں ان کی شان میں جنبش لب کرتی ہوں تو لگتا ہے جیسے کوئی فرات میری جسم کے اندر سے بہتے ہوئے آنکھوں سے پھوٹ پڑی ہے۔آنسوؤں کی نمی اور آواز کی شعلگی کا یہ متزاج ہی میرے فن کی معراج ہے آنسوؤں کا یہ سیلاب مجھے کبھی کربلا کے مقتل میں بہا لے جاتا ہے کبھی شام کے بازار سے گزرتی بیبیوں کا ہم سفر بنا دیتا ہے، کبھی قید خانے میں ابدی نیند سورہی بی بی سکینہ کی زیارت کراتا ہے تو کبھی ثانیٔ زہرا کے روضے تک لے جاتا ہے۔

()

خاک مل کر، ترے روضے کی، جبیں پر زینبؑ
جگمگاتا ہے بہت میرا مقدر زینبؑ

()

حشر تک دین ہے ہر ایک بلا سے محفوظ
تو نے باندھے ہیں وہ تعویذ بہتّر زینبؑ

()

اپنی پلکوں کے شبستان میں رکھّا ہے تمہیں
تم صحیفہ ہو، تو جزدان میں رکھّا ہے تمہیں

()

جتنے آنسو ہیں سبھی نذر کئے ہیں تم کو
ہم نے ہر شعر کے وجدان میں رکھّا ہے تمہیں

()

میرا فن اہل بیت سے منسوب ہے فن ہی کیا میرا غم میری خوشی بلکہ یوں کہوں کہ میری زندگی خدمت اہل بیت کے لئے وقف ہے۔اسی لئے میں جب مدحت اہل بیت کرتی ہوں تو یقینی طور پر مولیٰ مجھے سہارا دیتے ہیں جب جب لڑکھڑاتی ہوں تو علمدار کے بازو مجھے تھام لیتے ہیں بی بی رہنمائی کرتی ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے زیر اثر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

دل تو دیوانہ ہے اپنا ہی اسے ہوش نہیں
اسلئے دل میں نہیں جان میں رکھّا ہے تمہیں

سوال

سنیتا جھینگرن صاحبہ! یوں تو آپ کو شہرت وعزت بھی ملی اور اعزاز واکرام سے بھی نوازا گیا مختلف سطحوں پر مختلف انداز سے آپ کی پذیرائی وعزت افزائی کی گئی لیکن کیا ابھی یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید ابھی سنیتا جھینگرن کے فن اور ان کی صلاحیتوں کا اتنا حق ادا نہیں کیا گیا جتنی آپ مستحق ہیں۔کیا کہنا چاہتی ہیں؟

جواب

ارے بھائی! جانے دیجئے۔افسوس ہوتا ہے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اپنے کوائف فلاں جگہ بھیج دیجئے۔فلاں ایوارڈ کے لئے درخواست لگا دیجئے۔ فلاں شخص سے مل لیجئے۔خدا معاف کرے میں مولا کے در کی بھکارن سرکاری افسروں کی خوشامد کیسے کروں؟ کہاں سے لاؤں وہ ضمیر وہ خمیر۔آویدن اور نویدن اور وہ بھی میں۔مجھ سے نہیں ہوسکا۔سچے کلاکار اور اچھے فنکار کو آویدن اور نویدن نہیں کرنا چاہئے۔

حقیقی فنکار کا تو ابھی نندن ہونا چاہئے اور ویسے بھی ایسے بہت سے فنکار ہیں جو محرومی کا احساس لئے فن سے جڑے رہتے ہیں لیکن مجھے کسی ستائش کسی تمغے کی ضرورت نہیں مجھے دنیا سے انعام واکرام نہیں چاہئے، اعزاز والقاب نہیں چاہئے لیکن مولیٰ کی نگاہِ کرم کی طلبگار وخواہاں ہمیشہ رہی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔

سوال

آپ کے پسندیدہ اشعار جو بھی ہوں، کچھ سنائیے؟

جواب

چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

()

یا علیؑ کہہ کے جو گنگا میں لگایا ہوتا
مشکل آساں ہوئی کوثر کے کنارے نکلے

()

ہو نہیں سکتا کبھی بوڑھا اسلام
اس کو ہم شکل پیمبر نے جوانی دی ہے

()

میرے جوش عقیدت نے کہا تقدیر سے پہلے
زباں کو پاک کر لے مدحت شبیرؑ سے پہلے
فرشتوں آؤ لاکے رکھ دو آب کوثر
وضو کرنا ہے مجھ کو مدحت شبیرؑ سے پہلے

طارق قمر

بہت عمدہ۔ لیجئے! اب میں بھی آپ کو اپنے سلام کے چند اشعار سناتا ہوں:

()

قصر ہے سہا ہوا قدموں کی رفتار کے ساتھ
جیسے موت آئی ہو زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

()

کربلا دیکھ کے لگتا ہے بہتّر ہیں حسینؑ
ایک ہے سب کا جواب ایک ہی معیار کے ساتھ

()

غرق تھیں فکر شریعت میں رسولوں کی صفیں
سب کے سر اٹھ گئے شبیرؑ کے انکار کے ساتھ

()

رائج الوقت جو سکہ ہے تو بس آنسو ہے
لوگے ذکیا حشر میں ان درہم و دینار کے ساتھ

()

ایک لمحے کو بھی زنجیر کہاں روک سکی
وقت چلتا ہی رہا صبر کی رفتار کے ساتھ

()

اس طرح سجدوں کے ہمراہ ہے تسبیح بتولؑ
جیسے زینبؑ کا سفر عابد بیمار کے ساتھ

()

جب کبھی ذکر ہو حیدرؑ کے ثناخوانوں کا
نام طارق کا بھی ہو میثم تمار کے ساتھ

❑❑❑

آہ! مسرور باجی

عطیہ پروین
نیا مکان، سید پور، ردولی، فیض آباد
موبائل: 9696783987

مسرور جہاں صاحبہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ یہ یقین نہیں ہوتا ہے مگر یقین کرنا پڑتا ہے۔ دل درد سے بھر جاتا ہے، آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ یہ سوچ کر:

'زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'

مسرور باجی سے میں بہت قریب تھی یا یہ کہ وہ مجھ سے بہت لگاؤ رکھتی تھیں۔ ہم دونوں کی برسوں ملاقات نہ ہوتی مگر خط و کتابت اور پھر فون پر ہم برابر بات کیا کرتے ایک دوسرے کی ادبی سرگرمیوں کی خبر رکھتے ابھی کچھ دن پہلے ان کو کہیں ایک افسانہ پڑھنے کو مل گیا۔

کشکول مرا بھر دو۔ مجھے فون کیا مبارک باد دی۔ پاکیزہ آنچل میں تو ہم دونوں چھپتے بھی اور ایک دوسرے کو مبارک باد بھی دیا کرتے۔ اللہ آج بھی ان کی وہ کچھ گھن گرج والی اور سیدھی دل میں اتر جانے والی محبتوں سے لبریز آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

کیسی ہو عطیہ! کبھی توفیق نہیں ہوتی خود سے بھی فون کرلیا کرو۔

ڈھیروں کتابوں اور افسانوں کی خالق ایک اچھی خوش مزاج، خوش گفتار اور شاید خوش رفتار بھی۔ میرا ان کے ساتھ قلمی اور ادبی رشتہ تو تھا ہی ایک اور رشتہ بھی تھا، وہ سسرالی رشتہ تھا۔ دور کا سہی مگر ایک پیاری سی ڈور بندھی تھی۔ وہ میری نند ہوتی تھیں مگر مجھے بہن کہتی تھیں۔ میرے شوہر کاظم مہدی نقوی صاحب کا جب گونڈہ سے فتح پور ٹرانسفر ہوا تو میرا اور ان کا تعلق اور قریبی ہو گیا۔ فتح پور ایک اچھا قصبہ ہے اور وہ ان کا مائکہ ہے۔ وہ برابر وہاں آیا کرتی تھیں۔ محرم اور چہلم میں بہت ساتھ رہتا، ان کا بیٹا اسلم چھوٹا سا تھا اور بہت پیارا تھا۔ ایک دن چہلم میں مسرور باجی نے ان کو کالا کرتا اور سفید علی گڑھ کٹ پائجامہ پہنایا تھا۔ مجھ سے بہت خوش ہو کر بولیں:

عطیہ! دیکھو، میرا نواب آج سچ مچ کا نواب لگ رہا ہے۔

جب بھی وہ فتح پور آتیں، دونوں مل کر خوب باتیں کرتے۔ افسانوں، ناولوں کی بھی اور قطعی گھریلو بھی۔

میں جب رائے بریلی میں تھی تو اس زمانے میں برابر لکھنؤ جانا ہوا کرتا تھا۔ وہاں میرا نانیہال بھی ہے اور کبھی ریڈیو اسٹیشن کہانی ریکارڈ کرانے، کبھی کسی ادبی محفل میں شرکت کرنے یا کبھی کوئی خاندانی پروگرام ہوتا، مسرور باجی سے ضرور ملتی۔

ایک بار حامدہ حبیب اللہ صاحبہ کے یہاں ایک ادبی محفل میں ان کی مزاحیہ رگ ایسی پھڑکی کہ کسی ضرورت سے باہر برآمدے میں جا کر واپس آئیں تو میرے بازو میں چٹکی کاٹ کر بولیں:

محترمہ! آپ یہاں قلمی کہانی سنانے میں مصروف ہیں اور وہاں میاں صاحب ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔ پریوں کے بیچ میں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔

وہ پریاں ہم لوگوں کی ادبی ساتھی تھیں اور باہری برآمدے میں رک کر نقوی صاحب کی خیریت پوچھ رہی تھیں کیونکہ ہم سب خواتین اندر ہال میں تھیں

اللہ آج بھی ان کی وہ کچھ گھن گرج والی اور سیدھی دل میں اتر جانے والی محبتوں سے لبریز آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

کیسی ہو عطیہ! کبھی توفیق نہیں ہوتی خود سے بھی فون کرلیا کرو۔

ڈھیروں کتابوں اور افسانوں کی خالق ایک اچھی خوش مزاج، خوش گفتار اور شاید خوش رفتار بھی۔ میرا ان کے ساتھ قلمی اور ادبی رشتہ تو تھا ہی ایک اور رشتہ بھی تھا، وہ سسرالی رشتہ تھا۔ دور کا سہی مگر ایک پیاری سی ڈور بندھی تھی۔ وہ میری نند ہوتی تھیں مگر مجھے بہن کہتی تھیں۔ میرے شوہر کاظم مہدی نقوی صاحب کا جب گونڈہ سے فتح پور ٹرانسفر ہوا تو میرا اور ان کا تعلق اور قریبی ہو گیا۔ فتح پور ایک اچھا قصبہ ہے اور وہ ان کا مائکہ ہے۔ وہ برابر وہاں آیا کرتی تھیں۔ محرم اور چہلم میں بہت ساتھ رہتا، ان کا بیٹا اسلم چھوٹا سا تھا اور بہت پیارا تھا۔ ایک دن چہلم میں مسرور باجی نے ان کو کالا کرتا اور سفید علی گڑھ کٹ پائجامہ پہنایا تھا۔ مجھ سے بہت خوش ہو کر بولیں:

عطیہ! دیکھو، میرا نواب آج سچ مچ کا نواب لگ رہا ہے۔

جب بھی وہ فتح پور آتیں، دونوں مل کر خوب باتیں کرتے۔ افسانوں، ناولوں کی بھی اور قطعی گھریلو بھی۔

اور وہ باہر بیٹھے اردو کی ایک ادیبہ کے شوہر ہونے کی سزا جھیل رہے تھے۔

اس طرح کی ظرافت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

ہنستا ہوا چہرہ، مسکراتی آنکھیں، اس روز مجھے آنسو بہاتی نظر آئیں جب ان کے جوان بیٹے کا گوا میں انتقال ہو گیا تھا اور میں یہ روح فرسا خبر سن کر ان کے پاس پہنچی تھی۔

عطیہ! میرا دل میرے بچے کے ساتھ چلا گیا ہے، میرے پاس نہیں رہا۔

پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں کے موتی لٹاتی اس روز مجھے ملی تھیں جب میرے شوہر کے اچانک دنیا سے چلے جانے پر وہ لکھنؤ سے رائے بریلی آ کر میرے بچے اور میرے گلے لگی تھیں پھر وہ رائے بریلی تب آئیں جب میرے شوہر کی فرقت کا داغ مندمل تو نہیں ہوا تھا مگر زندگی نے کچھ بھر ضرور دیا تھا۔ میرے بچے اور میرے ان گنت ادبی ساتھی اس غم کے دریا سے مجھے کھینچ کر ادب اور قلم کا واسطہ دے کر لے آئے تھے۔

ایک بہترین شاعر اور ادیب رئیس رائے بریلوی صاحب اور مشہور ہر دل عزیز شاعر حسن رائے بریلوی صاحب نے ایک ادبی نشست کا پروگرام بنایا اور مسرور باجی کو دعوت دینے کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی۔ فوراً تیار ہو گئیں۔ میرا بیٹا فرحان لکھنؤ جا کر انہیں لے آیا۔ مل کر بیحد خوش ہوئیں۔

میں جب رائے بریلی میں تھی تو اس زمانے میں برابر لکھنؤ جانا ہوا کرتا تھا۔ وہاں میرا ننہال بھی ہے اور کبھی ریڈیو اسٹیشن کہانی ریکارڈ کرانے، کبھی کسی ادبی محفل میں شرکت کرنے یا کبھی کوئی خاندانی پروگرام ہوتا، مسرور باجی سے ضرور ملتی۔

ایک بار حامدہ حبیب اللہ صاحبہ کے یہاں ایک ادبی محفل میں ان کی مزاحیہ رگ ایسی پھڑکی کہ کسی ضرورت سے باہر برآمدے میں جا کر واپس آئیں تو میرے بازو میں چٹکی کاٹ کر بولیں: محترمہ! آپ یہاں قلمی کہانی سنانے میں مصروف ہیں اور وہاں میاں صاحب ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔ پریوں کے بیچ میں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔

وہ پریاں ہم لوگوں کی ادبی ساتھی تھیں اور باہری برآمدے میں رک کر نقوی صاحب کی خیریت پوچھ رہی تھیں کیونکہ ہم سب خواتین اندر ہال میں تھیں اور وہ باہر بیٹھے اردو کی ایک ادیبہ کے شوہر ہونے کی سزا جھیل رہے تھے۔

بہترین نشست تھی۔ میرا اور ان کا افسانہ اور باقی لوگوں کی شاعری، صدارت مسرور باجی کی تھی۔ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھائی۔ ان کا افسانہ بہت پسند کیا۔ کھانا کھا کر ہم لوگ واپس آ گئے اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے، ساری رات باتوں میں نکل گئی۔ رائے بریلی والے چاہ رہے تھے۔ مسرور باجی رک جائیں اور بڑے پیمانے پر ایک اور نشست کی جائے مگر انہوں نے معذرت کر لی اور یہ وعدہ کیا جب بھی وہ بلائی جائیں گی بقول ان کے سر کے بل آؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ ہنس دی تھیں۔ جب بھی لکھنؤ جاتی، ان سے ملنے کی کوشش کرتی تھی۔ بڑا روشن اور کھلا کھلا گھر تھا ان کا۔ بچے خوب دوڑ بھاگ کرتے۔ میں منع کرتی تو مجھے ڈانٹ دیتیں۔

ان کا گھر ہے جو جی چاہے کریں۔ تم چپکے بیٹھو۔

بہت دل چاہ رہا ہے، کچھ اور لکھوں مگر کیا لکھوں، قلم کانپنے لگتا ہے اور دل سسک اٹھتا ہے۔ اللہ اب ان کو مرحومہ لکھا جائے گا۔ اللہ ان پر اپنی رحمت و برکت کا نزول رات و دن جاری رکھے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے مگر کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جو دنیا سے جا کر بھی دلوں میں زندہ رہتی ہیں مسرور باجی بھی ایک ایسی ہی ہستی ہیں جو ہمیشہ اہل ادب کے دلوں میں زندہ رہیں گی۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ
موبائل: 8172845795

میری بجّو

فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد لوگ ایک ایک کر کے قبر سے دور ہوتے گئے اور میں قبر کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری بجو میرے سامنے اس دو گز زمین کا حصہ بن چکی تھیں جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔کل رات اپنی بیٹی سے باتیں کرتے کرتے اچانک ان کی حالت خراب ہوگئی۔ برستے پانی میں اسری رات گھر کے لوگ انہیں اس اسپتال سے اس اسپتال لے کر دوڑتے رہے لیکن کچھ نہ ہو سکا سویرا ہوتے ہوتے بجو اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ میری بجو۔ افسانہ نگار و ناول نگار مسرور جہاں ایک ہی رات میں خود ایک ایسی کہانی کا عنوان بن گئیں جس کے بارے میں وہ برسوں سے سوچ رہی تھی۔

یادوں پٹارا کھول کر میں بجو کی ایک ایک تصویر تلاش کر رہا ہوں۔ وقت کی دھول میں یہ تصویریں دھندلی ضرور پڑ گئیں ہیں لیکن ان کے رنگ اتنے مدھم نہیں ہوئے کہ میں انہیں پہچان نہ سکوں۔ہنستی، مسکراتی ،سرخ و سفید رنگت والی بجو میں نے جب سے ہوش سنبھالا تب ہی سے انہیں دیکھتا چلا آیا ہوں وہ مجھ سے تین چار سال بڑی تھین۔ دس بھائی بہنوں میں سب سے بڑی۔بجو کے بعد میرے بڑے بھائی بابو تھے پھر میں میرے بعد وسرے بھائی بہن تھے جن میں ایک بہن اور ایک بھائی دس بارہ سال کی عمر میں ختم ہو گئے تھے۔

بجو اپنی دوھیال فتح پور جو بارہ بنکی ضلع کی ایک تحصیل ہے وہاں پیدا ہوئی تھین وہاں ابا کا بڑا سا گھر تھا باغات اور زمینیں تھیں یہ ساری جائیدار میرے دادا کی خریدی ہوئی تھی۔ دادا جو پروفیسر ناصری کے نام سے مشہور تھے۔ان کی شادی فتح پور میں ہوئی تھی۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں باہر رہتے تھے۔اس لیے انہوں نے دادی کے لیے یہ بڑا سا گھر بنوایا تھا تا کہ وہ آرام سے رہ سکین گھر سے ملی ہوئی پھلواری تھی جس میں طرح طرح کے پھولوں کی کیاریاں اور گملے تھے۔ پھلواری میں دادا کا بنوایا ہوا امام باڑا بھی تھا جس کے سامنے ایک گول حوض تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ گھر کے سامنے گلی کے دوسری طرف دادا نے ایک نئے طرز کا بڑا سا بنگلہ بنوایا تھا جہاں ان کا کتب خانہ بھی تھا۔ جب دادا فتح پور میں ہوتے تو جو لوگ ان سے ملنے آتے وہ اسی بنگلے میں قیام کرتے تھے۔ دادا کو ہم لوگوں نے نہیں دیکھا۔اماں بتاتی تھیں کہ ان کی شادی چند برس پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

ابا نصیر حسین خیال لکھنؤ میں ٹیچر تھے۔اس لیے ہم سب لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ابا نے ہم لوگوں کا نام بھی اسکول میں لکھوا دیا تھا۔بجو کشمیری محلہ گرلس اسکول میں پڑھتی تھیں وہ اسکول کے ٹھیلے سے جس میں پردہ لگا ہوتا تھا اسکول جاتی تھیں۔ پھر وہ بس سے اس کو جانے لگی تھی۔ بجو کو ناول اور رسالے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔جب وہ فتح پور میں ہوتیں تو وہاں بھی دادا کے کتب خانے سے کتابیں اور رسالے نکال کر پڑھا کرتی تھیں ان کے اسی شوق نے ان میں لکھنے کی صلاحیت پیدا کی اور وہ افسانے لکھنے لگیں۔ پہلے وہ فرضی ناموں سے کہانیاں لکھتی رہیں تا کہ گھر میں خاص کر ابا کو نہ معلوم ہو پھر مسرور خیال کے نام سے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

بجو کے پاس کوئی اعلیٰ ڈگری نہیں تھی۔صرف ہائی اسکول پاس تھٰن۔ ہائی اسکول کے اردو امتحان میں انہیں امتیازی نمبر ملے تھے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے ایک دو سال کے بعد ان کی شادی نواب آغا میر کے پر پوتے نواب سید مرتضیٰ علی خان عرف بڑے نواب سے ہوئی جو کانپور والے نواب کے نام سے مشہور تھے۔شادی کے بعد انہوں نے اپنے اصلی نام مسرور جہاں کو اپنا ادبی نام بھی بنا لیا اور وہ مسرور جہاں کے نام سے لکھنے لگیں۔ان کے شوہر کو ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا زیادہ وقت کانپور کی جائداد، مقدمے بازی اور ان کبوتروں میں گزرتا تھا جو انہوں نے اپنی کوٹھی میں پال رکھے تھے۔اس زمانے میں بجو ان سے چھپ کر کہانیاں لکھتی تھی۔ اکثر باورچی خانے مین جہاں کھانا پکانے والی کھانا پکاتی رہتی اور وہ ایک کونے میں بیٹھ کر کہانیاں لکھتی رہتیں۔ دھیرے دھیرے ان کے شوہر کو ان کے لکھنے کا پتہ چل گیا لیکن انہون نے ان کے لکھنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔اس کے بعد وہ آرام سے کہانیاں لکھنے لگیں۔

اس وقت ان کی کہانیاں شمع، بیسویں صدی، بانو اور دوسری رسائل میں شائع ہونے لگیں تھی۔دو چار ناول بھی شائع ہو چکے تھے۔ان کی تھوڑی بہت شہرت بھی حاصل ہو چکی تھی مگر وہ ان نشستوں سے دور رہیں جہاں ادبی محفلیں جما کرتی تھیں۔گھر کی ذمہ داریوں

نے انہیں باہر نکلنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کا کام لکھنا تھا سو وہ لکھتی رہیں بغیر کسی صلے یا ستائش کی تمنا کے۔ ان دنوں بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ مسرور جہاں کو فرضی نام ہے اس نام سے کوئی اور لکھ رہا ہے۔

شوہر کے انتقال کے چند برسوں میں انہوں نے گھر سے نکلنا شروع کیا۔ خواتین کی بزم اردو اور دوسرے جلسوں میں کبھی کبھی وہ شرکت کرنے لگیں۔ عائشہ صدیقی، صبیحہ انور، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رام لعل، رتن سنگھ، نیر مسعود، عابد سہیل، انتظار حسین وغیرہ سے تعارف ہوا۔ اس کے باوجود ان میں نمایاں ہونے کی للک کبھی پیدا نہیں ہوئی۔

دوسروں کی پریشانیاں انہیں اپنی پریشانیاں لگتی تھیں۔ اپنی ضرورتوں کو تج کر دوسروں کی مدد کرنا ان کی فطرت تھی۔ ناولوں اور افسانوں سے انہیں جو معاوضہ ملتا تھا وہ اسے دوسروں پر خرچ کر دیتی تھیں۔ گھر کے اخراجات سے جو پیسہ بچ جاتا تھا وہ بھی دوسروں ہی کے کام آتا تھا۔ ایک زمانے میں گھر کے پاس کی مسجد میں رہنے والا ایک خاندان مالی حالات کا شکار تھا۔ وہ ان کے گھر والوں کو کسی نہ کسی بہانے اپنے گھر لے آتی تھیں اور آٹھ آٹھ دس دس دن اپنے پاس رکھتی تھیں اور ہر طرح ان کا خیال رکھتی تھیں۔ یہی سلوک وہ گھر کے ملازموں کے ساتھ رکھتی تھیں۔ کسی کو اسپتال لئے جا رہی ہیں تو کسی کی دوا دارو کا انتظام کر رہی ہیں۔

ابا کے انتقال کے بعد گھر کے مالی حالات کافی خراب ہو گئے تھے۔ میں اکیلا کمانے والا تھا اور میری تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ آٹھ بھائی بہنوں کے تعلیمی اخراجات اور گھر کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اس وقت بجو اماں کا سب سے بڑا سہارا تھیں۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو سارے بھائی بہن چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے ترس جاتے۔ عید میں چاند رات سے پہلے وہ سب کے لئے نئے جوڑے خرید کر لاتیں۔ اماں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتیں۔ میں ان کی شفقتوں کو اگر بیان کرنا چاہوں تو بھی بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو ان کی محبتوں کو بیان کر سکیں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بھائی بہنوں کے لئے

ابا کے انتقال کے بعد گھر کے مالی حالات کافی خراب ہو گئے تھے۔ میں اکیلا کمانے والا تھا اور میری تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ آٹھ بھائی بہنوں کے تعلیمی اخراجات اور گھر کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اس وقت بجو اماں کا سب سے بڑا سہارا تھیں۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو سارے بھائی بہن چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے ترس جاتے۔ عید میں چاند رات سے پہلے وہ سب کے لئے نئے جوڑے خرید کر لاتیں۔ اماں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتیں۔ میں ان کی شفقتوں کو اگر بیان کرنا چاہوں تو بھی بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو ان کی محبتوں کو بیان کر سکیں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بھائی بہنوں کے لئے جو کچھ کیا ایسا شاید ہی کسی بہن نے کیا ہو۔

دکھ اس بات کا ہے کہ مسرور جہاں نام کے باوجود ان کی زندگی خوشیوں سے خالی رہی۔ دوسروں کے دکھ دور کرنے والی مسرور جہاں کو زندگی نے اتنے دکھ دئے کہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اتنے دکھ کبھی جھیل نہ پاتا۔ ان کی زندگی، زندگی نہیں ایک المیہ تھی۔ ان واقعات کو دہرانا میرے لئے ممکن نہیں۔ ان کے کئی افسانے ان کے ذاتی المیوں کی حقیقت ہیں۔ ان کی زندگی کا آخری دکھ اس گھر کا چھٹنا تھا جسے انہوں نے اس طرح سجایا، سنوارا تھا کہ لوگ اسے دیکھتے رہتے تھے۔

جو کچھ کیا ایسا شاید ہی کسی بہن نے کیا ہو۔

دکھ اس بات کا ہے کہ مسرور جہاں نام کے باوجود ان کی زندگی خوشیوں سے خالی رہی۔ دوسروں کے دکھ دور کرنے والی مسرور جہاں کو زندگی نے اتنے دکھ دئے کہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اتنے دکھ کبھی جھیل نہ پاتا۔ ان کی زندگی، زندگی نہیں ایک المیہ تھی۔ ان واقعات کو دہرانا میرے لئے ممکن نہیں۔ ان کے کئی افسانے ان کے ذاتی المیوں کی حقیقت ہیں۔ ان کی زندگی کا آخری دکھ اس گھر کا چھٹنا تھا جسے انہوں نے اس طرح سجایا، سنوارا تھا کہ لوگ اسے دیکھتے رہتے تھے۔ یہ گھر کیا چھوٹا وہ سدا کے لئے اپنے آپ سے بچھڑ گئیں اور اس گھر کے چھوٹنے کے ایک سال کے اندر ہی انہوں نے اس دنیا کو بھی چھوڑ دیا۔ ان کے آخری دنوں کا افسانہ 'نقل مکانی' اسی گھر کے در و دیوار کا ماتم ہے۔

میں ان سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ کبھی کبھی اتنا بگڑ جاتا کہ ان کے پاس جانا بھی چھوڑ دیتا تھا۔ اگر میں چند روز ان کے پاس نہ جاتا تو وہ پریشان ہو جاتی تھیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس بار میں نہیں وہ روٹھیں گی اور اس طرح روٹھیں گی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جائیں گی۔

پانی تھم چکا تھا۔ لوگ جا چکے تھے۔ میں روتی آنکھوں سے اس قبر کو دیکھتا رہا جس نے میری بجو کو مجھ سے دور کر دیا تھا۔ مگر وہ تو برسوں پہلے ہی اس قبر میں زندہ دفن ہو چکی تھیں۔ یہ تو ان کی پرچھائیں تھیں جو آج نظروں سے اوجھل ہوئی ہے۔ وہ تو اسی دن مر چکی تھیں جس دن ان کے جوان بیٹے کی لاش آئی تھی۔ ان کا وجود تو بہت دن پہلے ملبے کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ اتنے دنوں تک وہ اس ملبے کے ڈھیر کو ڈھوتی رہی تھیں۔ آج وہ ملبے کے ڈھیر بھی ریزہ ریزہ ہو کر اس مٹی میں مل گیا جس میں نہ جانے کتنی کہانیاں دفن ہیں۔ ان کی زندگی کا افسانہ بھی اس مٹی میں دفن ہو گیا لیکن میں اپنی بجو کو کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ جب تک ان کی یادوں کا پٹارا میرے ساتھ ہے ان کی ایک ایک تصویر نکال کر دیکھا کروں گا۔ اس سے باتیں کروں گا، وہ ساری باتیں جنہیں کہنے کی حسرت شاید کبھی پوری نہ ہو۔

❑❑❑

مسرور جہاں: شخصیت کے آئینے میں

ڈاکٹر پروین شجاعت
شعبۂ اردو، ممتاز پی جی کالج لکھنؤ
موبائل: 9889783464

گذشتہ دنوں اردو کی مشہور افسانہ و ناول نگار محترمہ مسرور جہاں صاحبہ ہم سب سے جدا ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ میں نے ان کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا تھا اور اس کو تحریری شکل دے رہی تھی۔ محرم کی مصروفیات ختم ہو جانے کے بعد اس بات چیت کی فائنل تحریر ان کو جا کر دکھانا تھی تا کہ اشاعت کے لیے مسرور باجی کی خواہش کے مطابق ''نیا دور'' میں بھیج دوں۔ مگر افسوس!!! سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنا رختِ سفر باندھ لیں گی۔ ان کی زندگی میں یہ گفتگو شائع نہ ہو سکنے کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ بغیر کسی تبدیلی کے آج یہ انٹرویو آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔

آج میں آپ کی ملاقات اردو ادب کی ایک ایسی افسانہ نگار خاتون سے کروانے جا رہی ہوں جنھوں نے گھر کی چہار دیواری میں رہ کر اپنی محنت، لگن و ریاضت سے ادب میں وہ مقام حاصل کر لیا جسے پانے کی ہر ادیب کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں اور بین الاقوامی سطح پر اپنی صلاحیتوں کو ثابت کر چکی ہیں..... ایک ایسی شخصیت جس نے عالمی شہرت حاصل کرنے کے باوجود اپنی تہذیب کے مدار پر قائم رہ کر اپنی وضع قطع، شائستگی اور خودداری سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی شخصیت ایسی نہیں ہے جو بھیڑ میں کہیں گم ہو جائے۔ لکھنوی زبان و تہذیب کی مکمل نمائندگی کرتی ہوئی یہ شخصیت ہے محترمہ مسرور جہاں صاحبہ کی جو آج مجھ سے گفتگو کر کے اپنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے جا رہی ہیں۔ احمد فراز صاحب کے اس شعر کے ساتھ میں اپنی گفتگو کا آغاز کر رہی ہوں:

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سوال:

میں یہ چاہتی ہوں کہ میں اپنے سوالات کا سلسلہ آپ کی ادبی مصروفیات سے ہٹ کر آپ کی ان یادوں سے شروع کروں جو آپ کے بچپن سے وابستہ ہیں یا وہ بزرگ جن سے آپ کو تربیت حاصل ہوئی؟

جواب:

آپ نے بچپن کا ذکر کر کے مجھے اس دور میں پہنچا دیا جو ہر انسان کی زندگی کا خوبصورت ترین زمانہ ہوتا ہے۔ بے فکری اور معصومیت کا وہ حسین دور جب یہ دنیا بہت خوبصورت لگتی ہے، بچہ حیرانی سے ہر نئی چیز کو دیکھتا ہے شوق اور تجسس اسے نئے نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ میں بھی عام سا بچہ تھی۔ میری پیدائش ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ میرا وطن تحصیل فتحپور ضلع بارہ بنکی ہے۔ کیوں کہ یہ میرے والد کا وطن بھی ہے۔ حالاں کہ میری ساری زندگی لکھنؤ میں گزری۔ ددیہال اور ننھیال میں مجھے بہت اچھے بزرگ ملے۔ خاص طور سے میری دادی اور نانی کا میری زندگی میں بہت اہم مقام ہے۔ ان کی سنائی ہوئی کہانیاں اور قصّے میری تربیت کا اہم حصّہ ہیں۔ یہی کہانیاں میری ذہنی تربیت میں معاون رہیں۔

سوال:

آپ کی پرورش ایک غیر معمولی ادبی ماحول میں ہوئی اپنے مکمل تعلیمی سفر پر روشنی ڈالیں اور اس سلسلے میں آپ کو اپنے بزرگوں اور والدین سے کتنا حوصلہ ملا؟

جواب:

ابتدائی تعلیم تو ہر بچے کی طرح کلام پاک اور اُردو کے قاعدے سے شروع ہوئی۔ چار سال کی عمر میں اسکول میں داخلہ ہوا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ننھیال اور ددیہال میں ادبی ماحول ملا۔ ہر چند میرے دادا پروفیسر شیخ مہدی حسین ناصری کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کی کمی کو ان کے گراں قدر کتب خانہ نے پورا کر دیا خاندان میں ان کی علمی قابلیت، شاعری اور ادبی زندگی کے چرچے تھے۔ دادا مرحوم نے علم کا جو چراغ روشن کیا تھا اس نے نوجوانوں کی زندگی کو بہت متاثر کیا تھا۔ انہیں خاندان کے نوجوانوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی تھی اور وہ انہیں اپنے پاس رکھ کر تعلیم دلواتے تھے۔ پروفیسر ناصری صاحب کا ادب میں بلند مقام تھا۔ ان کی تصانیف قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کی کتاب ''صنادید عجم'' اب تک کورس میں شامل ہے اور ان کا دیوان ''نذر احباب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فراق گورکھپوری، پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین وغیرہ

آپ کے شاگردوں میں شامل تھے۔ میرے ابا جناب نصیر حسین خیال اسلامیہ کالج میں مدرس تھے اور ایک کامیاب شاعر تھے۔ اماں گھریلو خاتون تھیں۔ لیکن بچوں کی تعلیم میں بہت دلچسپی لیتی تھیں یہی سبب ہے کہ میرے بھائی بہن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں میرا بھائی وقار ناصری ایک کامیاب شاعر اور ادیب ہے۔

سوال:

آپ کی پیدائش ایک ایسے عہد میں ہوئی جس میں مشرق اور مغرب کی کشمکش اپنے شباب پر تھی ایک طرف سیاسی رہنما اپنے ملک کو وغلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے تن من اور دھن سے لگے ہوئے تھے تو دوسری طرف مذہبی اور سیاسی مصلح قوم اپنے ملک کو جہالت، تنگ نظری اور مذہبی قدامت پرستی سے آزاد کرانے کے لیے مختلف تحریکیں چلا رہے تھے۔ مسلمانوں میں جدید علوم وفنون سے آگاہی اور تعلیم نسواں پر خاص توجہ دی جارہی تھی۔ اس انقلاب انگیز ماحول کا آپ کی ذہنی پرداخت پر کیا اثر ہوا؟

جواب:

آپ نے ٹھیک کہا۔ یہ سیاسی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ سیاسی رہنماؤں کی اپنی مصروفیات تھیں جو اپنے وطن کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ وہیں کچھ حضرات قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے سرگرداں تھے۔ سرسید کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، جن کی محنت اور کوششوں سے علی گڑھ یونیورسٹی وجود میں آئی۔ آج دنیا میں علی گڑھ یونیورسٹی کا نام ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بیڑہ مولوی کرامت حسین صاحب نے اٹھایا۔ ان کی کوششوں سے کرامت حسین مسلم گرلس اسکول وجود میں آیا جو ترقی کی منزلیں طے کرکے آج ایک نمایاں مقام حاصل کرچکا ہے۔ اور اب وہاں ایم۔ اے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اور بلاتخصیص مذہب وملت آج ہزاروں لڑکیاں وہاں تعلیم حاصل کررہی ہیں۔

سوال:

آپ نے جس عہد میں لکھنا شروع کیا اس وقت زیادہ تر افسانہ نگار کسی نہ کسی تحریک۔ جیسے ترقی پسند تحریک وغیرہ سے متاثر ہوکر افسانے لکھ رہے تھے۔ اس وقت کیا آپ بھی کسی تحریک سے متاثر ہوئی تھیں؟ کیوں کہ آپ کی فکر دوسرے افسانہ نگاروں سے بالکل الگ نظر آتی ہے۔

جواب:

جس وقت میں نے شعور سنبھالا اس وقت ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا اور بیشتر افسانہ نگار ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر لکھ رہے تھے۔ افسانوں کے علاوہ ناول اور شاعری بھی ترقی پسند تحریک کے اثر سے مبرا نہیں تھی۔ میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں ذوق وشوق سے پڑھتی تھی۔ ان سے متاثر بھی تھی۔ لیکن میں نے ان کی ٹولی سے الگ رہ کر اپنا راستہ تلاش کیا۔ دراصل بیشتر لکھنے والے بطور فیشن بھی خود کو ترقی پسند کہلانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کسی تحریک میں شامل نہ ہونے کا سبب شاید میرا ماحول بھی تھا۔

سوال:

اپنی معاصر افسانہ نگاروں میں آپ کس کی تحریر سے متاثر ہیں اور اس کی خاص وجہ؟

جواب:

جہاں تک اس زمانہ کی افسانہ نگار خواتین سے متاثر ہونے کا سوال ہے تو مجھے آپا صالحہ عابد حسین، شکیلہ اختر اور حجاب امتیاز علی کی تحریریں پسند تھیں۔ عام طور سے خواتین اے، آر خاتون کی ناولیں پسند کرتی تھیں کیوں کہ ان کی ناولوں میں خالص مشرقی ماحول کی عکاسی ہوتی تھی۔

سوال:

آپ کے نزدیک کسی تخلیق کار کا انقلاب پسند ہونا یا نہ ہونا کتنی اہمیت رکھتا ہے؟

جواب:

جو تخلیق کار انقلاب سے متاثر ہوئے ان کی تخلیقات عام روش سے ہٹ کر ایک خاص رجحان کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں نیا پن ہے۔ ایک نئی زندگی کی نوید ہے۔ اور ترقی پسند خیالات سے ہمیں روبرو کرانے کا ہنر بھی انقلاب میں مضمر ہے۔

سوال:

افسانہ اپنی تکنیک سے بڑا بنتا ہے یا اپنے خیال سے آپ کی رائے جاننا چاہوں گی؟

جواب:

افسانے کی کامیابی کسی خاص رجحان، تکنیک یا خیال کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ کبھی افسانہ اپنی خاص تکنیک کے سبب کامیاب ہوتا ہے اور کبھی افسانے کا مرکزی خیال اس کی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے۔ یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ افسانے کی تکنیک کس حد تک متاثر کرتی ہے یا محض خیال کسی افسانے کی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے کسی افسانے کی کامیابی کے لیے ہم کسی ایک پیمانے کو موثر نہیں ٹھہرا سکتے یہ افسانے کی ڈیمانڈ پر منحصر ہے۔

سوال:

یہ کہا جاتا ہے کہ تخلیق کار بھی سماج اور معاشرہ کا ایک حصہ ہوتا ہے وہ جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے اپنے گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوکر کرتا ہے۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق رکھتی ہیں؟

جواب:

دراصل افسانے کی اساس ہمارے گردوپیش پر ہی ہوتی ہے۔ کہانیاں ہوا میں تخلیق نہیں ہوتیں ان کے صفحۂ قرطاس کی زینت بننے کے لیے کسی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بنیاد ہمیں ہمارا گردوپیش مہیا کرتا ہے۔ اور ماحول ہماری مدد کرتا ہے۔ ہماری آنکھ جو دیکھتی ہے ذہن ودل جس واقعہ سے متاثر ہوتا ہے، وہی کہانی کی تخلیق کے لیے ایک مضبوط بنیاد

فراہم کرتا ہے۔

سوال:

ادب تخلیق کرنے شروعات آپ نے کس عمر سے کی؟

جواب:

یہ بتانا تو مشکل ہے کہ ادب تخلیق کرنے کی باقاعدہ شروعات کس عمر سے کی۔ البتہ یہ یاد ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے اوٹ پٹانگ کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں۔ رفتہ رفتہ تحریروں میں پختگی اور سنجیدگی آتی گئی۔

سوال:

اپنے ۶۵/ ناولوں اور پانچ سو افسانوں میں سے اپنے پسندیدہ ناول اور افسانوں کے نام بتائیں۔ یہ بھی بتائیں کہ آپ کی کہانیوں کے کردار اور واقعات حقیقی ہیں یا تصوراتی؟

جواب:

ناولوں اور افسانوں کی تعداد اہمیت نہیں رکھتی۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ نے کیسا لکھا، یا آپ کی کس تحریر سے قاری متاثر ہوا؟ جہاں تک میری بات ہے، مجھے اپنا ناول 'نئی بستی' پسند ہے۔ افسانوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اب سیکڑوں افسانوں میں سے دو چار افسانوں کے نام لینا مناسب نہیں ہے۔ میرے افسانوں کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ واقعات کہانی کو سہارا دیتے ہیں۔ آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ کسی خاص واقعے یا کردار سے متاثر ہو کر ہی کہانی وجود میں آتی ہے۔ یوں بھی اب جنوں اور پریوں کی کہانی سے قارئین مطمئن ہونے والے نہیں ہیں۔ آج کا انسان پہلے کے انسانوں کے مقابلے میں زیادہ باشعور اور حقیقت پسند ہے۔

سوال:

نوابوں اور جاگیرداروں کی عیاشی اور بے راہ روی کو لے کر بہت ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں آپ نے بھی اپنے افسانوں میں ان موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی بیگمات کے کردار کی پیش کش میں ان کی زندگی کے ہر رخ کو پیش کیا ہے۔ افسانہ 'کنجی' میں کنجی، اور انجمن آرا کے کردار کیا آپ نے کسی حقیقی کردار سے متاثر ہو کر لکھے ہیں؟

جواب:

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک زمانے میں حیدرآباد کی ایک خاتون افسانہ نگار نے حیدرآباد کے نوابین اور رؤساء کو ہدف بنا کر بے حد رنگین افسانے اور ناول لکھے تھے۔ وقتی طور پر تو ان کی خوب واہ واہ ہوئی لیکن پھر یہ طوفانی غبار وقت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آج کوئی انہیں یاد بھی نہیں کرتا۔ انہیں آپ موسمی افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے بھی نوابین اور رؤساء کو مرکزی خیال بنا کر افسانے لکھے ہیں۔ لیکن میرا مقصد انہیں رانِدِ درگاہ کرنا نہیں تھا۔ ویسے تو انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے لیکن اس کے کردار کے کچھ روشن پہلو بھی ہوتے ہیں جنہیں پیش کرنا ہماری ذمے داری ہے۔ جہاں تک میری کہانی 'کنجی' کا تعلق ہے.....تو 'کنجی' ایک حقیقی کردار ہے باقی کہانی بس ایک کہانی ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

> افسانے کی کامیابی کسی خاص رجحان، تکنیک یا خیال کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ کبھی افسانہ اپنی خاص تکنیک کے سبب کامیاب ہوتا ہے اور کبھی افسانے کا مرکزی خیال اس کی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے۔ یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ افسانے کی تکنیک کس حد تک متاثر کرتی ہے یا محض خیال کسی افسانے کی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے کسی افسانے کی کامیابی کے لیے ہم کسی ایک پیمانے کو موثر نہیں ٹھہرا سکتے یہ افسانے کی ڈیمانڈ پر منحصر ہے۔

سوال:

افسانہ ''کہاں ہو تم'' عہد حاضر کا المیہ ہے۔ یہ بھی کسی حقیقی واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے؟

جواب:

بدنصیبی کا تعلق ہم انسانوں سے ہی ہوتا ہے۔ یہ دراصل میری زندگی کا ایسا المیہ ہے جس نے مجھے توڑ پھوڑ کر کرچیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔

سوال:

روسی زبان کے علاوہ کیا دنیا کی کسی دوسری زبان میں بھی آپ کے افسانوں اور ناولوں کا ترجمہ ہوا ہے؟

جواب:

میرے افسانوں پر تاجک زبان میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی گئی ہے۔ پھر ان افسانوں کا۔ بلکہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا روسی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ میرے افسانے تاجک اور روسی زبان میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ البتہ اپنے ملک کی کئی زبانوں میں میرے افسانوں کا ترجمہ ہوا ہے۔ مثلاً تمل، تیلگو، کنڑ، ہندی، پنجابی، کشمیری اور انگریزی۔

سوال:

اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے شہر سے آپ کو بہت پیار ہے۔ لکھنؤ سے باہر جا کر جب واپس آتی ہیں تو کیسا محسوس کرتی ہیں؟

جواب:

اوّل تو میں لکھنؤ سے باہر بہت کم گئی ہوں۔ لیکن جب بھی گئی ہوں تو واپس آ کر ایسا محسوس ہوا کہ اپنی ماں کی نرم گرم آغوش میں آ گئی ہوں۔

سوال:

ہماری خواتین اور نوجوان نسل کو آپ کیا پیغام دینا چاہتی ہیں؟

جواب:

میرا سب کے لیے بس ایک ہی پیغام ہے کہ بہتر سے بہتر تعلیم حاصل کریں اور اپنے وطن کے لیے کچھ ایسا کریں کہ زمانہ آپ کو یاد رکھے اور آپ کی زندگی دوسروں کے لیے ایک مثال ایک نمونہ بن جائے۔

❑❑❑

نعت

در در جبیں جھکائی احساس کمتری نے
لاکھوں خدا بنائے انساں کی بت گری نے

صدقے میں مصطفیؐ کے جاگے شعورِ ذہنی
دھوکے دئے تھے ورنہ ہر نقش آذری نے

پیدا کیا دلوں میں احساس اشرفیت
منزل بلند کر دی تیری پیمبری نے

آئے جو سر اٹھا کر اٹھے وہ سر جھکا کر
کلمے پڑھا دئے ہیں خلق پیمبری نے

اسلام تیرا ایسا آئین حق نما ہے
کھائی شکست جس سے رسم ستمگری نے

مغرب میں ڈوب کر پھر حکم نبیؐ سے پلٹا
الٹا سفر کیا ہے خورشید خاوری نے

یا ایّھا المزمل، یا ایّھا المدثر
کیا کیا لقب دئے ہیں اخلاص داوری نے

نیّر نہ کیوں ہو نازاں رندانہ جرأتوں پر
پہنچا دیا کہاں تک زورِ سخنوری نے

سید توکل حسین نیّر سلطانپوری

نعت

رسولؐ آئے زمانے میں پیام آشتی لائے
اندھیری رات میں ماہِ منور بن کے مسکائے

رسولؐ آئے تنزلی پر جب ایماں کے اصول آئے
وہ ہر اک دور میں لوگوں کو راہ راست پر لائے

فریبوں کی مگر نہ آندھی چلی جب جب رسول آئے
وہ جن پر پھول برسانے تھے ان پر سنگ برسائے

رسول آئے مگر جاتے ہی ان کے اس جہاں والے
پلٹ کر ظلم کی خونی ڈگر پر پھر چلے آئے

نہ جانے عقل کے ناخن یہ کب لیں ظلم کے تاجر
کہ خوش کش ہیں عمل ان کے، کوئی تو ان کو سمجھائے

رسولوں کی حیات افروز باتیں آج بھی سن کر
امیدوں کی کوئی شمع فروزاں کاش ہو جائے

وہ تھے آرامِ جاں، لطف جہاں تو جان ایماں بھی
لپٹ کر ان کی یادوں سے یہ گوتمؔ کیوں نہ اترائے

کرشن گوتم
3251، سیکٹر D-44، چنڈی گڑھ
موبائل: 9464041556

تیغ عریاں

عشرت قتل گہہ اہل شہادت بڑی چیز
تیغ عریاں کے نظارے کی بھی لذت بڑی چیز

زخم لگتے رہے کھلتے رہے چہرے کے گلاب
زندگی حق پہ مٹانے کی سعادت بڑی چیز

صحن مقتل میں رفاقت کے چمکتے ہوئے رخ
سطح ظلمت پہ دمکتی ہوئی صورت بڑی چیز

تیغ قاتل سے بجھی تشنہ دہانیٔ اجل
فاقہ مستی میں ابھرتی ہوئی طاقت بڑی چیز

صبر کے پارے کا ڈھونڈے نہ کنارا کوئی
دل خراشی کی حلاوت میں ہے وسعت بڑی چیز

صبح امید کی ہے شام غریباں ضوپاش
ذلتوں سے یہ ابھرتی ہوئی عزت بڑی چیز

جیت حق کی ہوئی بے نامؔ ہے باطل اب تک
سچ ہے اولاد نبیؐ کی ہے مودت بڑی چیز

مولانا شمیم الحسن
جوادیہ عربی کالج، پرہلادگھاٹ، کاشی
موبائل: 9451277786

سلام

خشک و تر پر پیاس ہے قبضہ ترا
سب ترے صحرا ترا دریا ترا

جسم کی شاخوں میں پتے بھی نہیں
پھر بھی لا محدود ہے سایہ ترا

تو سمندر تشنگی کے دشت میں
اور تری موجیں ہر اک پیاسا ترا

پاک سوروں کی طنابوں پر رکا
حافظوں میں نصب ہے خیمہ ترا

زیر خنجر اور سر منبر سنا
زندگی نے ایک ہی لہجہ ترا

اک مجاہد اور آئے گا ابھی
نامکمل ہے ابھی قصہ ترا

اک کاظمؔ کیا زمانے نے سنا
ہر ادب کے شہر میں چرچا

کاظم جرولی
297/115، نصیر منزل، شاہ گنج، نخاس، لکھنؤ
موبائل: 9335208337

سلام

لگا کے لفظوں پہ اعرابِ معرفت اس نے
سرِ فرات لکھی پیاس کی لغت اس نے

برا لگا نہ کسی کو کبھی بھی اس کا سخن
کبھی کسی سے نہیں کی ہے معذرت اس نے

بہت غرور تھا موجوں کو ایک چلو سے
اتار دی رخِ دریا کی تمکنت اس نے

سر فرات بہ عنوان تشنگیٔ حسینؑ
لکھی ہے دستِ بریدہ سے منقبت اس نے

سوال بیعت فاسق سے دور حاضر تک
کبھی پنپنے نہیں دی یزیدیت اس نے

وہ طفل ہو کہ جواں پیش مرضیٔ خالق
سپرد مقتل جاں کی ہے ذریت اس نے

زمین گنج شہیداں خرید کر صہباؔ
عطش کے نام ہبہ کر دی ملکیت اس نے

صہبا جرولی
شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ
موبائل: 9305740421

سلام

چاہتی مشک ہے سارا سمٹ آئے دریا
آبرو اپنی اسی طرح بچائے دریا

سوکھے ہونٹوں کو کرے مس جو لب موج ذرا
اپنی قسمت پہ نہ کیوں موج میں آئے دریا

خشک مشکیزے میں در آئے یہی چاہتا ہے
پیاس بچوں کی کسی طور بجھائے دریا

شور کیسا سر مقتل یہ صدا ہے کیسی
ہے گرفتارِ عطش کون بتائے دریا

کتنا نزدیک ہے پر دور بہت پیاسوں سے
سوچتا رہتا ہے بہتا چلا جائے دریا

قافلہ جا بھی چکا بے سرو سامانی میں
اپنا جاں بخش خزانہ ہے لٹائے دریا

کیوں نہ تسلیم کرو، گوہر مضموں بخشے
تشنۂ فکر وفاؔ، ہے یہ عطائے دریا

مصطفیٰ زیدی
فلیٹ نمبر ۴، کالندی ولا اپارٹمنٹ، فیض آباد روڈ، لکھنؤ
موبائل: 9450280368

سلام

ہماری آنکھ سے کوثر چھلک اٹھا تو نہیں
پئے وضو جو کھڑے ہیں ملائکہ تو نہیں

حسین کہتے ہیں آنکھوں سے گر پڑے آنسو
قریب آنکھوں کے رومال سیدہ تو نہیں

صدائیں ماتم شہ کی سنائی دیتی ہیں
ہمارے دل میں بسی کوئی کربلا تو نہیں

یہ آندھیاں، یہ تلاطم، یہ خون کی بارش
جفا کی زد پہ کہیں کوئی بے خطا تو نہیں

پٹک رہی ہے سر اپنا فرات کی موجیں
رخ اپنا موڑ کے پیاسا کوئی ہٹا تو نہیں

بریدہ سر کہیں پڑھتا ہے آیت قرآں
جفاگرو یہ کوئی مظہر خدا تو نہیں

ضمیرؔ لکھا گیا نوحہ، مرثیہ و سلام
مگر یہ حق ہے کہ حق ہو سکا ادا تو نہیں

مولانا ضمیرالحسن
جوادیہ عربی کالج، پرہلادگھاٹ، کاشی
موبائل: 7007138883

سلام

ہمارا کام اسی در پہ ہے صدا دینا
ہے جس کا کام طلب سے کئی گنا دینا

بس اک جھلک مرا اشک عزا دکھا دینا
پھر اس کے بعد سکندر کو آئینہ دینا

غم حسینؑ بلاتا ہے خود ہی لوگوں کو
ہمارا کام ہے فرشِ عزا بچھا دینا

گلے پہ تیر چلانا کوئی کمال نہ تھا
کمال تھا علی اصغرؑ کا مسکرا دینا

کئے حسینؑ نے راہب کو سات بیٹے عطا
نصیب ہی ہے بدلنا تو ایک کیا دینا

سوائے حضرت قاسمؑ کسی کے بس میں نہیں
چکھے بغیر کوئی ذائقہ بتا دینا

یہ میرے اشک عزا اور یہ مدح شہ جرارؔ
انہیں کا کام ہے جنت میں گھر بنا دینا

جرار اکبرآبادی
زہرا کالونی، بڑا باغ، مفتی گنج، لکھنؤ
موبائل: 9450018588

سلام

لئے ہے دولت عزم و ثبات مٹھی میں
علم ہے دوش پہ نہر فرات مٹھی میں

کہا نصیب نے حر سے کہ چل سوئے سرورؑ
حسینؑ رکھتے ہیں راہِ نجات مٹھی میں

زمانہ کس لئے سمجھے نہ مصطفیؐ اس کو
وہ سویالے کے نبیؐ کے صفات مٹھی میں

یہ بھر کے مشک سکینہ کو کہہ رہا ہے جری
جفا شعاروں یہ دیکھو فرات مٹھی میں

بلند فرق ہے نیزے پہ جسم تیروں پر
وہ سو رہا ہے لئے کائنات مٹھی میں

اٹھائی لاش جواں اور بنائی قبر صغیر
لبوں پہ شکر خدا حادثات مٹھی میں

ہو فکر کس لئے کوثرؔ کو روزِ محشر کی
ثنائے شہ سے ہے اپنی نجات مٹھی میں

کوثر زیدی لکھنوی
شہنائی اپارٹمنٹ، اے ونگ، فلیٹ نمبر G/02، ممبرا، تھانے (مہاراشٹر)
موبائل: 9892198887

سلام

جلا کے دشت میں بیعت شکن نفی کے چراغ
بجھائے موسیٰ دوراں نے سامری کے چراغ

زمانہ روشنیٔ فکر جس سے پاتا ہے
وہ سب جلائے ہوئے ہیں حسینؑ ہی کے چراغ

عجب تھا صبح دہم سوزِ لہجۂ اکبرؑ
جلا گیا دلِ حرؑ میں دلاوری کے چراغ

بنا کے دشت میں قربانیوں کا اک فانوس
کئے ہیں شاہ نے محفوظ حق رسی کے چراغ

بجھا کے خیمے کی شمعیں حسینؑ ابن علیؑ
جلا رہے ہیں اندھیرے میں آگہی کے چراغ

وہ نور گنج شہیداں میں ہے کہ لگتا ہے
دیارِ موت میں جلتے ہیں زندگی کے چراغ

جو قدرداں ہیں وہ پروانہ وار دیکھیں گے
نصیرؔ رکھ دو جلا کے سخنوری کے چراغ

نصیر اعظمی
1306، بریزور یزیڈنسی، شیواجی نگر، سنگل گوونڈی، ممبئی
موبائل: 9323507475

سلام

ہجرتِ عاشور کی ساری تھکن پہنے ہوئے
سو گیا سورج لہو کا پیرہن پہنے ہوئے

شورِ گریہ میں بدلنے ہیں اسے سب قہقہے
خامشی جھولے سے نکلی ہے سخن پہنے ہوئے

دے گیا توحید کے پیکر کو روحِ زندگی
سجدۂ شبیرؑ تیروں کی چبھن پہنے ہوئے

سورجوں نے توڑ ڈالی اس کی امید سحر
شام پھرتی ہے اندھیرے میں گھٹن پہنے ہوئے

ان کے ہی قدموں تلے ہیں آسمانوں کی حدیں
خاک پر بیٹھے ہیں جو داغِ رسن پہنے ہوئے

مقتل جاں میں شہادت زیب تن کر کے محبؔ
روح جسموں سے نکل آئی بدن پہنے ہوئے

محبؔ مورانوی
محلہ سیدواڑہ، مورانواں، اناؤ
موبائل: 8795474821

سلام

ہیچ ہر جلوہ ہے نورِ ایزدی کے سامنے
تیرگی ٹکتی نہیں ہے روشنی کے سامنے

ہے کھلا مولا کا در حاجت روائی کے لئے
ہاتھ پھیلائیں فرشتے اس سخی کے سامنے

زیر اعدا ہو گئے سبط نبی ہیں سرخرو
ہیچ تھی بیعت حسینؑ ابن علیؑ کے سامنے

تھا حیاتِ جاوداں جب نینوا کا معرکہ
تھی اجل حیرت زدہ خود زندگی کے سامنے

کربلا میں وہ اثر تھا حضرتِ عباسؑ کا
رگ گیا طوفانِ باطل خود جری کے سامنے

کیوں نہ عظمت ہوتی سقائے سکینہؑ پر فدا
پھینکا ہے چلو کا پانی تشنگی کے سامنے

ہیں عزیزؔ خاص کے حاجت روا بارہ امام
کیوں جھکاؤں سر نہ میں بارہ دری کے سامنے

پروفیسر ڈاکٹر عزیز حیدر عزیزؔ
سابق صدر شعبۂ انگریزی، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ، وارانسی
موبائل: 9670207742

سلام

حسینؑ آئے ہیں کرب و بلا بلاتی ہے
آنسوؤ! آؤ زمین عزا بلاتی ہے

غم حسینؑ کی کالی گھٹا بلاتی ہے
حسینؑ والو! عزا کی جزا بلاتی ہے

کسی کے نام سے ہم کو بھی مل گئی عزت
کسی کے نام کو ذلت سدا بلاتی ہے

کہ جن کا حسن تبسم نبی کی راحت تھا
انہی کی آج بھی آہ و بکا بلاتی ہے

حسینؑ جیسا نسب ہے نہ جرأت انکار
یہ اہل کوفہ کی، کس کو جفا بلاتی ہے

کسی کی بیعت باطل رجھا رہی ہے ہمیں
کسی کی بیعت حق کی ندا بلاتی ہے

یزید والوں کی روحیں بھٹک رہی ہیں ندیمؔ
حسینؑ والوں کو راہِ بقا بلاتی ہے

ندیم صدیقی
الوصی، سیلیش نگر، نزد ریلوے اسٹیشن، تھانے ممبرا (مہاراشٹر)
موبائل: 9323786610

سلام

حسینؑ نقطۂ معراج آدمیت ہے
حسینؑ نوعِ بشر کے لئے بشارت ہے

حسینؑ اصل میں اک آدمی کا نام نہیں
حسینؑ حق و صداقت کی اک علامت ہے

حسینؑ نام نہیں صرف چار حرفوں کا
حسینؑ ایک مکمل کتابِ فطرت ہے

رگِ یقیں لہو بن کے دوڑتا ہے حسینؑ
اسی کے دم سے تو ایمان میں حرارت ہے

جو سوچئے تو سراپا رسولؐ کی سیرت
جو دیکھئے تو نبیؐ کی وہی شباہت ہے

حسینؑ فیصلہ کرنے میں حق بجانب تھے
جواب سہل نہیں ہے سوالِ بیعت ہے

رضا و فقر و غنا، اتقاء و خوف خدا
حیاتِ سبط نبیؐ ان سے ہی عبارت ہے

عبرت مچھلی شہری
محلہ خانزادہ، پوسٹ مچھلی شہر ضلع جونپور
موبائل: 76180344824

سلام

پسر کے جگر سے سناں کھینچتے ہیں
شہ دیں کا درد نہاں کھینچتے ہیں

انوکھا ہے پیاسوں کے مقتل کا منظر
گلے خنجروں کی زباں کھینچتے ہیں

نکل کر ابھی حر کو آنا پڑے گا
حسینؑ اک حصارِ اماں کھینچتے ہیں

وہ دھبہ ہے پوشاک انسانیت پر
جو اک بے زباں پر کماں کھینچتے ہیں

ذرا غور سے پائے عابدؑ تو دیکھو
ستونِ حرم بیڑیاں کھینچتے ہیں

چلو ہم بھی اشکوں سے قرطاس جاں پر
شبیہ امامِ زماں کھینچتے ہیں

خدائے سخن ان کو نایابؔ کر دے
جو تصویر ہم مدح خواں کھینچتے ہیں

نایاب ہلوری
سرفراز گنج، لکھنؤ
موبائل: 9795411786

سلام

الفت آل میں مرنے کو شہادت کہئے
اور قربیٰ کی محبت کو مودت کہئے

بات یہ صاف ہوئی اور پس کرب و بلا
ماتم سبط پیمبرؐ کو عبادت کہئے

حرؑ ترے سر پہ جو رومال بندھا زہراؑ کا
ایسا تحفہ ہے جسے تاجِ شفاعت کہئے

جون کا چہرہ چمکنے لگا مانند قمر
متصل نور سے ہے خوبیٔ قسمت کہئے

اک جواں لال کے سینے میں گڑا تھا نیزہ
کھینچ لینا اسے شبیرؑ کی طاقت کہئے

بعد شہؑ عابد و باقرؑ کی محافظ زینبؑ
ایسی ہستی کو تو فانوس امامت کہئے

آل کی کرنے ثنا برسر منبر آیا
اوج پر آج ہے احسنؔ کی بھی قسمت کہئے

کرنل سید جرار احمد احسنؔ نونہروی
را جی جی پورم، لکھنؤ
موبائل: 9415403051

سلام

شبیرؑ جس پہ دین خدا کا مدار ہے
ایثار و صبر و خلق کا پروردگار ہے

ہر زاویے سے فاطمہ زہراؑ کا لاڈلا
محبوب کردگار کا آئینہ دار ہے

نانا نبیؐ ہے، بھائی حسنؑ، ماں ہے فاطمہؑ
ان کا پدر ہے وہ جو شہ ذوالفقار ہے

زورِ علیؑ، خلوصِ نبیؐ، حلم مجتبیٰؑ
ساری فضیلتوں کا یہی ورثہ دار ہے

نام یزید بھول کے لیتا نہیں کوئی
شبیرؑ زندہ باد کی ہر سو پکار ہے

آنسو جو ذکر شہ پہ نکلتے ہیں آنکھ سے
ان آنسوؤں سے ملکۂ جنت کو پیار ہے

اشک غم حسینؑ سے دامن ہے تر ضمیرؔ
میرا محب آلِ عبا میں شمار ہے

ضمیر سید پوری
سید پور، شاہ گنج روڈ، نزد چینی مل، سلطانپور
موبائل: 9838953716

سلام

سہ گئے خود پہ باطل کا ہر اک وار حسینؑ
اسی حجت سے ہیں تحسین کے حقدار حسینؑ

حرمت دیں پہ کبھی آنچ نہ آنے پائی
روکتے ہی رہے دشمن کا ہر اک وار حسینؑ

سامنے آ نہ سکا دشمن ایماں کوئی
کھینچ کر جب بھی کھڑے ہو گئے تلوار حسینؑ

سورما کفر کے کھو بیٹھے توازن اپنا
اور جھپٹے جو کبھی برق کی رفتار حسینؑ

جس کی تمثیل کوئی دوسری ملتی ہی نہیں
پیش فرما گئے دنیا میں وہ ایثار حسینؑ

راستہ ہو گیا فردوسِ بریں کا آساں
وہ کہ طے کر چکے جب منزل دشوار حسینؑ

رب قبول ان کو کرے بس یہ دعا ہے فرقتؔ
پیش ہیں بارگہہ حق میں کچھ اشعار حسینؑ

عبدالقیوم فرقتؔ
رسی بٹان، مولوی گنج لکھنؤ
موبائل: 9874665871

سلام

جب آیا لب پہ برائے دعا حسینؑ کا نام
نصیب ساز بشر بن گیا حسینؑ کا نام

ہے کون فاتح عالم نظام عالم میں
مورخوں کو بھی لکھنا پڑا حسینؑ کا نام

کبھی جو ذکر ہوا تشنگی کا غربت کا
زباں پہ آ گیا بے ساختہ حسینؑ کا نام

نبی کی پشت پہ ہوں یا فراز نیزہ پر
بلندیوں پہ رہے گا سدا حسینؑ کا نام

چلے بھی آؤ ملے گا یہاں سکون دوام
ہر ایک درد کی ہے اک دوا حسینؑ کا نام

ازل کی صبح سے لے کر نبی برحق تک
ادب سے لیتے ہیں کل انبیاء حسینؑ کا نام

جو کلمہ گو نہیں رزمیؔ مگر ہے حق پرور
سمجھ رہا ہے وہ اک دیوتا حسینؑ کا نام

رزمی سلطانپوری
امہٹ چوراہا، سلطانپور
موبائل: 9839851245

سلام

یقیں نے رکھا جو پائے ثبات مقتل میں
گماں کی ہوگئی پل بھر میں مات مقتل میں

ادھر تو شوق بھی اندھا تھا ذہن بھی اندھا
نگاہ والوں نے پائی نجات مقتل میں

بلا کے دشت میں جود و سخا کا منظر تھا
'حسینؑ باٹ رہے تھے حیات مقتل میں'

چمک رہا ہے وہ نیرے پہ دین کا سورج
یزیدیوں کے لئے دن ہے رات مقتل میں

دکھاتے شاہ اگر ذوالفقار کے جوہر
تو بھیک میں بھی نہ ملتی حیات مقتل میں

چلی جو شمر کی تلوار کل ایماں پر
تڑپ کے رہ گئی کل کائنات مقتل میں

علیؑ کے لال نے کوثرؔ لٹا کے سر اپنا
خدا کے دین کو بخشی حیات مقتل میں

کوثر پروین کوثرؔ
2B، کمبر اسٹور، کلکتہ (مغربی بنگال)
موبائل: 9339784378

سلام

مظلومیٔ شبیرؑ کا اعلان ہیں آنسو
دنیا میں عزاداروں کی پہچان ہیں آنسو

تکلیف کوئی ہوگی تو آنکھوں سے بہیں گے
سچ یہ ہے کہ دردِ دل انسان ہیں آنسو

رومال میں جا فاطمہ زہراؑ کی ہیں پاتے
دیکھے تو کوئی کتنے لئے شان ہیں آنسو

گریہ میں اگر مقصد شبیرؑ نہیں ہے
بےروح پھر آنکھوں میں ہیں بے جان ہیں آنسو

جس کے طلب آب نے لشکر کو رلایا
اس اصغر بے شیر کی مسکان ہیں آنسو

ہے پیش نظر اہل حرم کی جو اسیری
اس واسطے نذر درِ زندان ہیں آنسو

اشعار نہ کیوں اشک فشانی پہ ہوں مبنی
نوحے کا منور مرے عنوان ہیں آنسو

منورسلطانپوری
مکان نمبر 1533، محلہ شاستری نگر، سلطانپور
موبائل: 8009202986

سلام

دین خدا ہے مقصد سرورؑ کا آئینہ
سرورؑ ہیں کربلا میں پیمبرؐ کا آئینہ

کرب و بلا میں اتنا غبار عطش اُڑا
دھندلا گیا یزیدی سمندر کا آئینہ

تصویر ظلم دید کے قابل نہیں رہی
پھوٹا جو حرملہ کے مقدر کا آئینہ

لوری سنا کے تیر ستم نے سلا دیا
آغوش کربلا بنی مادر کا آئینہ

زینبؑ نے دیں یہ کہہ کے ردا کی ضمانتیں
عباسؑ ہیں شجاعت حیدرؑ کا آئینہ

لاشِ جری پہ نوحہ کناں یوں حسینؑ تھے
دھندلا گیا ہے چشمِ برادر کا آئینہ

کانٹے نظر جو آئے گلوئے حسینؑ میں
اندھا ہوا ہے شرم سے خنجر کا آئینہ

کوثر زیدی
موضع و پوسٹ بھائیں، سلطانپور
موبائل: 8737061586

قطعات

سنجے مصرا شوق
538kha/231 دین دیال نگر، کھدرا، لکھنؤ
موبائل: 7905471168

داخل نہیں ہو پاؤگے اندازے سے
سیکھو یہ سبق ظلم کے خمیازے سے
میں علم کا ہوں شہر علی جس کا باب
آنا ہے تو آؤ اسی دروازے سے

جس وقت تھیں مصروفِ خطابت زینبؑ
اوڑھے تھیں چادرِ بلاغت زینبؑ
الفاظ کے شعلوں سے جھلستا تھا یزید
لگتا تھا کہ ڈھائیں گی قیامت زینبؑ

پھیلے ہوئے ساگر کو بھی قطرہ کر لے
ہمت ہے کسی میں کوئی ایسا کر لے
مولا کے سوا کون ہے جو مقتل میں
زخموں کے مصلے پہ بھی سجدہ کر لے

معیار صداقت کے اجالے ہیں حسینؑ
انکار کی لذت کو سنبھالے ہیں حسینؑ
بس حق کے تحفظ کے لئے دنیا میں
باطل کی جڑیں کاٹنے والے ہیں حسینؑ

جو شیر خدا خدا کا نائب ہے وہی
ہر ایک جگہ حاضر و غائب ہے وہی
ایک وقت میں دیکھا گیا چالیس جگہ
دنیا میں مظہر العجائب ہے وہی

سقائے سکینہؑ کا کرم ہے اب تک
سائے کی طرح سر پہ علم ہے اب تک
جو معرکۂ صبر ہوا کربل میں
عباسؑ کے ہاتھوں سے رقم ہے اب تک

میر ببر علی انیس

مرثیہ

گھر سے جب بہرِ سفر سیدِ عالم نکلے
سَر جھکائے ہوے بادیدہء پُرنم نکلے
خیوش و فرزند کمر باندہ کے پیہم نکلے
رو کے فرمایا کے اِس شہر سے اب ہم نکلے
رات سے گریائے زہرؑا کی صدا آتی ہے
دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لے جاتی ہے

رخ کیا شہہؑ نے سوئے قبرِ شہنشاہِ انام
بھر تسلیم جھو یکی موتا سیلی بیب سلام
اِذُن پڑھکر جو گئے قبر ے نزدیک امام
ارض کی آیا ہے آج آخری روکسات کو غلام
یہ مکان ہم سے اب آئی شاہی زمان چوت تھا حیا
آج حضرت کے ناواسی سے وطن چوت تھا ہے

چین سے سب ہے گھروں میں مجھے ملتا نہیں چین
ساقط آفت میں ہے اب اپکا یہ نورول آئیں
ٹکڑے دِل ہوتا ہے جب رو کے حرام کرتے ہے بین
ننھے بچو کو بھلا لے کے کدھر جاییا حسین
شہر میں چین نا جنگل میں امان ملتی ہے
دیکھیا قبر مسافر کو کاہان ملتی ہے

اب میرے سَر ے لیے تیز ہوئے ہیں خنجر
اہل کی شَر پہ کمر باندھے ہیں یا قایری بشر
آپ نے ڈی تھی اسی روزہ کی اماں کو قبر
والیدا روئے تھی دو روز تلک پیٹ ے سَر
اِس ناواسی کو مگر بھول ں جانا حضرت
ذبہ ے وقت مدد کرنے کو آنا حضرت

ہو دن ہے کے پرندے بھی نہیں چوردتی گھر
مجھ کو دَر پیش ہیں ان روزوں میں آفت کا سفر
ہے کہیں قتل کا سامان کبھی لٹ جانے کا دَر
سات ہے بچوں کا اے بادیشاہی جینو بشر
تنگ جینے سے ہوں پاس اپنے بلا لو نانا اپنی
تربت میں ناواسی کو چیپالو نانا

یہ بیان کر کے جو تعویذ سے لپٹے سرور
یوں حیلی قبر ے تھارای ضریع انور
آئی تربت سے یہ اوازیِ حبیب ی دوار
تیری غربت کے میں صدقے میرے مظلوم پسار
کوئی سمجھا نا میری جوود کا پالا تجھ کو
ہے ادا نئی مدینے سے نکالا تجھ کو

آئی میرے جایسوون ووالے میرے صابر شبیر
میرے بیکاس میرے مظلوم مسافر شبیر
نا رہا کوئے تیرا یاور و ناصر شبیر
ہے آئی غور ی-جاریبا کے موجور شبیر
تو جاحاین جاییا جا پیارے وہیں چلتا ہوں میں
خاک وداتا ہوا تربت سے نکلتا ہوں میں

کئی دن سے تیری مدار کو نہیں قبر میں چین
آئے تھی شب کو میرا پاس یہ کرتی ہوئی بین
گھر میرا لٹ تا ہے فریاد رسول اس ثقلین
صبحا کو اپن وطن چھوڑ ے جاتا ہے حسین
کہنے آئی ہوں ے منہ قبر سے مودون گی میں
اپنے بچے کو اکیلا تھو نا چودوں گی میں

سونکیِ یہ شاہ نئے کیا آخری روکسات کا سلام
نکلے روٹ ہوے جب روزہ ی انور سے امام
شہہ سے اُس دم یہ کیا رَو رَوے زینب نئے لام
قبر پر ماں کی مجھے لے چالو یا شاہی انعم
لوگ ہمراہ ہے ماحمیئین کیوں کر رو وو
ماں کی تربت سے پھِر اک بات لپٹ کر رو وو

ماں کی تربت پہ گئے شاہ با چشمی قون باڑ
اتری ماحمیل سے بسد آہ وفو جاحان زاینابی زار
دورد کر قبر سے لپٹے جو یمامی ابرار
ہات زہرہ ے لحد سے نکل آئی اک باڑ
آئی آواز نا رَو دِل کو قالاق ہوتا ہے
قبر ہلتی ہے کلیجہ میرا شاق ہوتا ہے

ہاں بولا وو میرا عباس ی-دیلاوار ہے کدھر
وہ فدا ہے میرے بچے پہ میں صدقے اس پر
شکم ی-گھایر سے ہے پر ہو ویرا ہے پسار
یہ سیڈ سن ے بیرادار کو پکارے سرور
ابھی راحوار کو آگے نا بڑھاؤ بھائی
یاد فرماتی ہے اماں ادھر آوو بھائی

آکے عباسؑ نے سَر راخدیا پاینی مزار
آئی زہرہ کی سدا میں تیری غربت ے نثار
اپنے پیاروں ے برابر میں تجھے کرتی ہو پیار
دھیان بھائی کی حفاظت کا رہے اے دلدار
کوئی غربت میں اسے مار نہ ڈالے بیٹا
میرا شبیرؑ ہے اب تیرے حوالے بیٹا

نوحہ

چاند کمہلایا ہوا نکلا شب عاشور کو
کس قدر غم کا اندھیرا تھا شب عاشور کو

زندگی کی گود میں وہ اضطراب کائنات
بن گئی بے شیر کا جھولا شب عاشور کو

اللہ اللہ چاہتے ہیں تجھ کو انصار حسینؑ
زندگی دلچسپ تھی گویا شب عاشور کو

ایسے بے پرواہ کہ جیسے سر ہی شانوں پر نہیں
زندگی نے موت سے پوچھا شب عاشور کو

کچھ صدائیں آرہی تھیں خیمۂ شبیرؑ سے
جنگ پر جب فیصلہ ٹھہرا شب عاشور کو

شمع لے کر روئے اکبر دیکھنے بیٹھی تھی ماں
درد کا طوفاں تھا دریا شب عاشور کو

نجمؔ گردوں سر بسجدہ ہے ستارے بے زباں
کس سے پوچھیں تم نے کیا دیکھا شب عاشور کو

نجم آفندی (حیدرآباد)

نوحہ

کہتی تھی سکینہ مرے بابا کو بلا دو
ڈھونڈھوں کہاں میں ان کو مجھے ان کا پتہ دو

میں ان سے کبھی پیاس کا شکوہ نہ کروں گی
میرے چچا عباس کو دریا سے بلا دو

مقتل میں چلی آؤں گی میں پاس تمہارے
بابا تم اگر لاشۂ بے سر سے صدا دو

کچھ اور طلب تم سے نہیں کرتی سکینہ
پیاسی ہوں میں اب ظالمو پانی تو پلا دو

بھیا علی اکبرؑ بھی تو مارے گئے رن میں
اب کس کو پکارے گی سکینہ یہ بتا دو

میں قید مصیبت میں گرفتار ہوں بابا
اس قید مصیبت سے مجھے آکے چھڑا دو

افشاںؔ جو اسے مارتا تھا شمر طمانچے
کہتی تھی سکینہ مرے عمو کو بلا دو

افشاں مہدی
5/399، وِرام کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل: 9935682330

اتر پردیش: ایک کھرب کی معیشت بننے کی جانب گامزن

نجیب انصاری
E-3/65، آمرپالی یوجنا، ہردوئی روڈ، لکھنؤ
موبائل: 9450604369

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نے اپنے اب تک کے دور حکومت میں سماج میں امن وتحفظ کا ماحول پیدا کرنے اور نوجوانوں، کسانوں، صنعت کاروں اور دیگر عام شہریوں کو ترقی کا مثبت ماحول مہیا کرانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ انہوں نے ۸۶/لاکھ سے زیادہ کسانوں کو فصلی قرض سے نجات دلانے کا فیصلہ لے کر ۳۶/ہزار کروڑ کے چھوٹے کسانوں کو بینک قرض سے نجات دلانے کو یقینی بنایا۔ بدعنوانی پر قدغن لگانے کے لئے ای ٹنڈرنگ سسٹم نافذ کیا۔ اینٹی رومیوں اسکوائڈ کی تشکیل کرکے خواتین میں تحفظ کے جذبے کو فروغ دیا گیا۔ یوپی انوسٹرس سمٹ-۲۰۱۸ء کا کامیاب انعقاد کیا گیا جس میں ۴ء۶۸/لاکھ کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کے ایم اوپر دستخط کئے گئے۔ پہلی گراؤنڈ بریکنگ سریمنی کے توسط سے ۶۰/ہزار کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کرائی گئی۔ میسرس سیمنگ کے ۴۹۱۵/کروڑ روپئے کے پروجیکٹ اور میسرس انکس کے ۵۰۰/کروڑ روپئے کے پروجیکٹ کو منظوری دی گئی۔ اس سے تقریباً ۸۲۵۴/لوگوں کو روزگار کے مواقع مہیا ہوں گے۔ ضلع گوتم بدھ نگر (نوئیڈا) کے زیور میں بین الاقوامی گرین فیلڈ ائیر پورٹ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے لئے آراضی کے حصول کی کارروائی شروع کی جا چکی ہے۔ ڈیفنس کاریڈور کے سلسلہ میں ۴۱۸۵/ہیکٹیئر آراضی کے انتظام کے لئے کارروائی تیزی سے جاری ہے۔ بندیل کھنڈ میں ریل کوچ فیکٹری کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے لئے ضروری کارروائی تیزی سے کی جارہی ہے۔ صنعت کاروں کو غیر ضروری بھاگ دوڑ سے بچانے کے لئے وزیر اعلیٰ کے دفتر کے تحت سنگل ونڈو کلیئرنس محکمہ قائم کیا جارہا ہے۔

ایک ضلع ایک پروجیکٹ (او ڈی او پی) اسکیم کے ذریعہ ہر ضلع کے مخصوص مصنوعات کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بڑے شاپنگ مال سے پارٹنرشپ کرکے ان مصنوعات کے لئے شوروم مہیا کرانے پر غور کیا جارہا ہے۔ حکومت نے اس کے لئے ایمیزان کے ساتھ سمجھوتہ بھی کیا ہے۔ او ڈی او پی کے ۳۰۰/مصنوعات کے لئے ایمیزان کوئی فیس نہیں لے گا۔ فی الوقت ۱۱۲۹۶/او ڈی او پی مصنوعات ایمیزان کی سائٹ پر دستیاب ہیں۔ ایمیزان کے توسط سے اب تک تقریباً ۸۰/لاکھ او ڈی او پی مصنوعات کی فروخت ہوئی ہے۔ او ڈی او پی اسکیم سے ریاستی حکومت کا ہر سال پانچ لاکھ لوگوں کو خود روزگار مہیا کرانے کا ہدف ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال تقریباً ۸۹/ہزار کروڑ روپئے سے زیادہ کے مال کو ایکسپورٹ کرنے کی بھی تیاری ہے۔ یقینا اس اسکیم کے توسط سے گاؤں سے شہر کی جانب ہجرت رکنے کے ساتھ ہی بے روزگاری بھی کم ہوگی۔

یوگی حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد ریاست کے ماحول میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ اب نظم ونسق، سڑک، بجلی اور امن وامان میں چاروں طرف بہترین نظر آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بڑے بڑے صنعت کار ریاست میں بے خوف ہوکر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ دوسری گراؤنڈ بریکنگ سریمنی میں ریاستی حکومت کی جانب سے واضح کیا گیا کہ گزشتہ ڈھائی سال میں ۶۲/ہزار کروڑ کے پروجیکٹس کو زمین پر اتارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱ء۵۰/لاکھ کروڑ کی سرمایہ کاری کا خاکہ تیار ہوگیا ہے۔ اس کوشش سے ریاست میں ۲۸/لاکھ نوجوانوں کو روزگار کے مواقع ملنے کی امید ہے۔ دوسری گراؤنڈ بریکنگ سریمنی میں ۶۵/ہزار کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کے ۲۹۰/پروجیکٹوں کی بنیاد رکھی گئی۔ وہیں صنعتی گھرانوں نے ریاست میں ملازمتوں کی بارش کر دی۔ میدانتا گروپ نے ۱۵/ہزار، دبئی کی لولو انٹرنیشنل نے پانچ دہزار، پیپسیکو انڈیا نے ۱۵۰۰/لوگوں کو ملازمت دینے کا اعلان کیا۔ لولو انٹرنیشنل کمپنی لکھنؤ میں دو ہزار کروڑ کے صرفہ سے ایشیا کا سب سے بڑا شاپنگ مال تعمیر اکرا رہی ہے جس کا ۷۰/فیصد کام مکمل ہو چکا ہے۔ فوڈ پروسیسنگ یونٹ بھی لگانے کا کمپنی کا منصوبہ ہے۔

اس کے علاوہ وارانسی، نوئیڈا اور صاحب آباد میں کمپنی شاپنگ مال تعمیر اکرا رہی ہے۔ اڈانی گروپ کے ذریعہ ۵۰۰۰/کروڑ روپئے سے پاور ٹرانسمیشن کے دو پروجیکٹوں پر کام چل رہا ہے۔ کمپنی کا ۵۰۰۰/کروڑ روپئے مزید خرچ کرنے کا منصوبہ ہے۔ کمپنی ۱۵/ہزار ٹن اسٹیٹ آف آرٹ اسٹیل پیداوار مرکز پر بھی کام کر رہی ہے۔ کمپنی وارانسی میں ملٹی ماڈل ریور ٹرمینل قائم کرے گی۔ اس کے علاوہ ڈاٹا سینٹر اور دفاع کے سیکٹر

میں بھی سرمایہ کاری کرے گی۔ پیپسیکو انڈیا ۵۱۴؍کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کر رہی ہے جس سے ۱۵۰۰ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ کمپنی ۲۰۲۲ء تک اسنیکس کاروبار کو دوگنا کرے گی۔ ۲۴؍ہزار کسان اس نیٹ ورک سے جڑے ہیں۔ کمپنی ۵۰۰؍کروڑ فوڈ پروسیسنگ میں خرچ کرے گی اور ۷۰۰۰؍ٹن آلو یوپی سے ہی لے گی۔ اس سے آلو کسانوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ لکھنؤ میں میدانتا اسپتال کے قیام سے ۱۵۰۰۰؍لوگوں کو روزگار ملے گا۔ محض ڈھائی سال کی مدت میں لکھنؤ میں میدانتا اسپتال تیار کرلیا گیا ہے۔ لکھنؤ کے بعد نوئیڈا، وارانسی، پریاگ راج اور گورکھپور میں بھی میدانتا اسپتال قائم کیا جائے گا۔ لکھنؤ کے ایک ہزار بیڈ پر مشتمل اسپتال کا ۱۵؍اکتوبر کو افتتاح کیا جائے گا۔ یوپی میں ٹاٹا گروپ کی ٹاٹا موٹرس اور ٹی سی ایس ہے۔ نوئیڈا اور وارانسی میں ریٹیل کمپنی ٹائٹن اور ویسٹ سائٹ ہے۔ یہاں کا کینسر سینٹر فروری میں شروع ہوجائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ٹاٹا پاور نے بھی یہاں کام کرنا شروع کردیا ہے۔ یوپی میں ٹاٹا گروپ کا ۳۰؍ہزار صلاحیت کا ٹریننگ سینٹر جلد شروع ہونے جا رہا ہے۔ ٹورنٹ گروپ پاور گیس سیکٹر میں چھ ہزار کروڑ کی سرمایہ کاری کرے گا۔ کمپنی نے ۱۴؍اضلاع میں گیس سپلائی نیٹ ورک قائم کیا ہے جس کا چار لاکھ لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ کمپنی ریاست میں ۲۰۰؍سی این جی اسٹیشن بھی لگا رہی ہے۔

موجودہ حکومت کی اب تک کی مدت کار میں بجلی کے میدان میں ۲۵؍۱ء لاکھ کروڑ روپئے کے کام ہوئے ہیں۔ گراؤنڈ بریکنگ سریمنی-۲ میں بھی ۱۲؍ہزار کروڑ کے ۳۶؍پروجیکٹ یوپی میں آنے والے ہیں۔ بجلی ترقی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ آئندہ پانچ برسوں میں بجلی ترسیل کے میدان میں ۲۰؍ہزار کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی بجلی پیداوار اور ترسیل میں بھی بہتری لائی جارہی ہے۔ ریاستی حکومت قومی راجدھانی علاقہ میں ۲۵۰۰؍۱ ایکڑ سے زیادہ رقبہ میں الیکٹرانک سٹی قائم کرنے جا رہی ہے۔ اس سے چار لاکھ سے زیادہ نوجوانوں کو روزگار ملے گا۔ اسی سٹی کے لئے یمنا ایکسپریس وے پر زمین کی تلاش کر لی گئی ہے۔ سیاحت کے زمرہ میں ۱۶۳۸ء۲۶؍کروڑ روپئے کی لاگت کے ۳۸؍پروجیکٹوں میں سرمایہ کاری کی جائے گی۔ ان میں سے چھ پروجیکٹوں کا کام شروع ہو چکا ہے۔ سیاحت پالیسی ۲۰۱۸ء کے تحت کل ۱۹۲ پروجیکٹوں کا رجسٹریشن ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ، اجودھیا، آگرہ، بریلی، گورکھپور، وارانسی، جونپور، متھرا، جھانسی اور مظفرنگر وغیرہ اضلاع میں ہوٹل بجٹ ہوٹل، ریزارٹ، ویلنیس سینٹر، ایڈونچر ٹورزم اور تھیم پارک میں سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ ریاست میں ۲۰۰؍فلمیں شوٹنگ کے عمل سے گزر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ۴۵۔۴۰ فلموں پر کام شروع ہو چکا ہے۔ ریاست کی خوبصورت لوکیشن پر فلم بنانے کے لئے فلم پروڈیوسر متوجہ ہو رہے ہیں۔ ان پروڈیوسروں کو سبسڈی، تحفظ، سنگل ونڈو سسٹم کے تحت سبھی مطلوبہ اجازت نامے اور نو آبجکشن کی سہولت مہیا کرائی جارہی ہے۔ مختصر یہ کہ اتر پردیش تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور بہت جلد ون ٹریلین ڈالر کی معیشت کا ہدف حاصل کرلے گا۔

> یوگی حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد ریاست کے ماحول میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ اب نظم ونسق، سڑک، بجلی اور امن وامان میں چاروں طرف بہترین نظر آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بڑے بڑے صنعت کار ریاست میں بے خوف ہوکر سرمایہ کاری کررہے ہیں۔ دوسری گراؤنڈ بریکنگ سریمنی میں ریاستی حکومت کی جانب سے واضح کیا گیا کہ گزشتہ ڈھائی سال میں ۶۲؍ہزار کروڑ کے پروجیکٹس کو زمین پر اتارا گیا۔
>
> اس کے ساتھ ہی ۵۰؍۱ء لاکھ کروڑ کی سرمایہ کاری کا خاکہ تیار ہوگیا ہے۔
>
> اس کوشش سے ریاست میں ۲۸؍لاکھ نوجوانوں کو روزگار کے مواقع ملنے کی امید ہے۔ دوسری گراؤنڈ بریکنگ سریمنی میں ۶۵؍ہزار کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کے ۲۹۰؍پروجیکٹوں کی بنیاد رکھی گئی۔ وہیں صنعتی گھرانوں نے ریاست میں ملازمتوں کی بارش کردی۔
>
> میدانتا گروپ نے ۱۵؍ہزار، دبئی کی لولو انٹرنیشنل نے پانچ دہزار، پیپسیکو انڈیا نے ۱۵۰۰؍لوگوں کو ملازمت دینے کا اعلان کیا۔
>
> لولو انٹرنیشنل کمپنی لکھنؤ میں دو ہزار کروڑ کے صرفہ سے ایشیا کا سب سے بڑا شاپنگ مال تعمیر اکرا رہی ہے جس کا ۷۰؍فیصد کام مکمل ہو چکا ہے۔ فوڈ پروسیسنگ یونٹ بھی لگانے کا کمپنی کا منصوبہ ہے۔

ریاستی حکومت کا عبوری بجٹ

ریاستی حکومت نے گزشتہ دنوں رواں مالیاتی سال کے لئے ۸۷ء۱۳۹۴ کروڑ روپئے کا عبوری بجٹ مجالس قانون ساز کے دونوں ایوانوں میں پیش کیا۔ اس عبوری بجٹ میں حکومت نے ریاست کے سات اور شہروں کو اسمارٹ سٹی کے طرز پر ڈیولپ کرنے کے اعلان کے ساتھ ہی شہروں میں بنیادی سہولیات کے لئے وافر رقم مختص کی ہے۔ ریاستی حکومت کی پوری توجہ بنیادی ڈھانچے کو درست کرنے اور شہری سہولیات بڑھانے پر ہے۔ اسی لئے عبوری بجٹ کا ایک بڑا حصہ ان اسکیموں کے نام کیا گیا ہے۔ اس میں معیشت کو رفتار دینے کے لئے ٹھوس قدم اٹھائے گئے ہیں۔ ایکسپریس سے، نئے پل آر او بی نیز سڑکوں کی تعمیر سے براہ راست صنعتی ترقی کو رفتار ملے گی۔ وہیں

نئی یونیورسٹیوں، میڈیکل کالج، سینک اسکول سے ریاست میں خوشحالی کا راستہ بنے گا۔ پوروانچل ایکسپریس وے، بندیل کھنڈ ایکسپریس وے اور گنگا ایکسپریس وے کے لئے بڑی رقم دی گئی ہے۔ بجلی کی تقسیم اور پیداوار کے پروجیکٹ نئی سڑکوں اور نئے پلوں کی تعمیر جیسے کاموں سے براہ راست ریاست کی معیشت کو رفتار ملے گی۔ طب وصحت اور تعلیم کے زمرے میں نئی اسکیموں کے لئے بجٹ دئے جانے سے ریاست خوشحالی کے راستے پر بڑھے گی۔ چودہ نئے میڈیکل کالجوں کے لئے ٹوکن رقم، طبی تعلیم کے لئے رقم، پی جی آئی میں ٹراما سینٹر، پانچ زیر تعمیر میڈیکل کالجوں کے لئے رقم، نئے اسکولوں کا قیام، گورنمنٹ کالجوں کی تعلیم، سینک اسکول، دونئی یونیورسٹیوں کے پروجیکٹ سے ریاست خوشحالی سے ہم کنار ہوگی۔ ان اسکیموں کے لئے بھی مناسب رقم کا انتظام کیا گیا ہے۔ نئی پنشن اسکیم کے لئے حکومت نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے اس میں اپنی ادائیگی کے لئے ۵۰۰۴ء۰۳/کروڑ روپئے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ریاستی حکومت نے اپنے عبوری بجٹ میں محکمۂ توانائی کو مختلف مدوں میں ۹۰۸ء۰۱/کروڑ روپئے دئے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ ۶۰۰/کروڑ روپئے اودئے اسکیم کے تحت یوپی پاور کارپوریشن کو ہوئے نقصان کی تلافی کے لئے دئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اوبرا بی پروجیکٹ میں کاموں کے لی ءبھی ۲۰۵ء۴۳/کروڑ روپئے کا بجٹ دیا گیا ہے۔ ریاست کی چار زرعی یونیورسٹیوں کے تحت زرعی سائنس مراکز کو سینٹر آف ایکسیلنس کی شکل میں فروغ دینے کے لئے ۹۰/کروڑ روپئے مختص کئے گئے ہیں۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کی سرکار نے وزیر اعظم نریندر مودی جی کے اصول 'سب کا ساتھ، سب کا وکاس اور سب کا وشواس' کا عبوری بجٹ میں بخوبی خیال رکھا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اسی کے مدنظر ریاست کے مسلم غلبہ والے اضلاع کے لئے رقم مہیا کرانے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے۔ سرکار نے مسلم غلبہ والے علاقوں کی ترقی کے لئے ۲۱۷/کروڑ روپئے کا انتظام کیا ہے۔

ایسا حال کے کئی برسوں میں پہلی بار ہوا ہے جب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کی کوششوں سے یوپی سب سے زیادہ ۱۱۵۶/کروڑ روپئے ملے ہیں۔ پہلے کی سرکاروں میں یہ رقم محض ۴۰۰/کروڑ روپئے سالانہ ہوتی تھی۔ یہ رقم پردھان منتری جن وکاس کاریہ کرم کے تحت دی گئی ہے۔

اس میں ریاست کے مسلم اکثریت والے ۴۷/اضلاع کے ۱۴۳/بلاکوں، ۱۵/ضلع صدر دفتر، ۸۹ نگر پالیکاؤں اور نگر پنچایتوں میں ترقیاتی کام کئے جائیں گے۔ ان اضلاع مین آئی ٹی آئی بنانے اور وہاں مسلم نوجوانوں کو فروغ ہنرمندی مشن کے تحت تربیت دینے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ان اضلاع میں مسلمانوں کی صحت کا بھی سرکار نے خیال رکھا ہے۔ سرکار نے ان اضلاع میں صاف صفائی کے لئے سوک پٹ بنانے کے ساتھ ہی پینے کے پانی کے انتظام کے لئے ۱۱۵/کروڑ روپئے دئے ہیں۔ عبوری بجٹ میں امداد یافتہ عربی فارسی مدرسوں کے ملازمین کی نئی پنشن اسکیم کے تحت ۳۱/مارچ ۲۰۱۹ء تک کے لئے حصہ داری کی خاطر ایک کروڑ روپئے کا انتظام کیا ہے۔ اسی طرح عربی فارسی مدرسوں کے مینجمنٹ کا حصہ جمع کرنے میں تاخیر پر واجب الادا سود کے لئے بھی ۵۰/لاکھ روپئے دئے گئے ہیں۔ وہیں ملازمین کی حصہ داری میں تاخیر پر بھی سود کے لئے ۵۰/لاکھ روپئے دئے گئے ہیں۔ ریاست کے اقلیتی کثرت والے اضلاع میں مدارس کی جدیدکاری کے لئے ۲۰/کروڑ روپئے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس سے کتابوں کے علاوہ کمپیوٹر وغیرہ کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ مسلم اکثریت والے اضلاع میں آئی ٹی آئی کی تعمیر کے لئے ۴۰/کروڑ روپئے دئے گئے ہیں۔ سرکاری انٹر کالجوں کی عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ہی اضافی درجات کی تعمیر کے لئے ۴۰/کروڑ روپئے دئے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ عبوری بجٹ ریاست کی ترقی کو اور زیادہ رفتار دے گا۔ یہ عبوری بجٹ ریاست میں شہری ترقی، پوروانچل ایکسپریس وے، توانائی، آبپاشی سمیت ریاست کی قابل فخر ثقافت اور سیاحت کے فروغ اور توسیع کے لئے کارآمد ثابت ہوگا۔

❑❑❑

خاص طور سے ان اضلاع میں ہوں گے کام: مرادآباد، بریلی، سہارنپور، میرٹھ منطقہ کے سبھی اضلاع۔ مشرقی اتر پردیش میں غازی پور، مئو، جونپور، اعظم گڑھ، سنت کبیر نگر، بستی، سدھارتھ نگر، پرتاپ گڑھ وغیرہ۔

یوگی سرکار میں ملا سب سے زیادہ بجٹ ریاست میں یہ اسکیم پہلے ملٹی سیکٹورل پلان کے نام سے چل رہی تھی۔ اب اسے پردھان منتری جن وکاس کاریہ کرم کر دیا گیا ہے۔ سال ۱۹-۲۰۱۸ء کے مالیاتی سال سے پہلے مرکز سے محض ۴۰۰/کروڑ کا بجٹ مل رہا تھا۔ ۱۹-۲۰۱۸ء میں وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کی کوششوں سے مرکز سے اس اسکیم میں ۱۱۵۶ کروڑ کا بجٹ ملا ہے جو اب تک کسی بھی مالیاتی سال میں سب سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی سے میری باقاعدہ شناسائی اس وقت ہوئی جب انہوں نے اپنی تحقیق کے سلسلہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اور استاد محترم پروفیسر شبیہ الحسن کے دولت کدے پر آنا شروع کیا۔ وہ اردو اور فارسی کے جید عالم اور بلند پایہ شاعر عزیزؔ لکھنوی پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے تھے۔ عزیزؔ لکھنوی پر مقالہ تحریر کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے نہ صرف اردو اور فارسی بلکہ عربی کی بھی شد بد ضروری تھی نیز شاعری کے رموز سے آگاہ ہونا بھی لازم تھا۔ استاد محترم پروفیسر شبیہ الحسن نے ضرور ان میں یہ خوبیاں دیکھی ہوں گی تبھی ان میں ایسے بڑے اور فاضل شاعر پر مقالہ لکھنے کی نہ صرف منظوری دی بلکہ اس مقالے کا نگراں بننا بھی قبول کر لیا اور ڈاکٹر مسعود ردولوی نے بھی اپنی محنت اور لیاقت کی وجہ سے استاد محترم کی نگرانی کا حق ادا کیا۔ انہوں نے عزیزؔ لکھنوی پر ایک مبسوط اور گرانقدر مقالہ لکھ کر نہ صرف پروفیسر شبیہ الحسن کی توقعات کو پورا کیا بلکہ تحقیق کے سے مشکل میدان میں سرخروئی بھی حاصل کی۔

میں یہاں اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ڈاکٹر مسعود ردولوی اور ڈاکٹر سکندر آغا مرحوم کے سے محنتی اور سنجیدہ محققین بہت کم دیکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست بلکہ یک جان و دو قالب تھے۔ دونوں ایک ساتھ گھر سے نکلتے اور پروفیسر شبیہ الحسن اور پروفیسر نیر مسعود کی قیام گاہوں پر ایک ساتھ پہنچتے۔ میں نے ان دونوں کو ان حضرات کی قیام گاہوں پر بارہا ایک ساتھ دیکھا اور صرف علمی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے پایا۔ ان دونوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے عمر کی اس منزل میں تحقیق کے میدان میں قدم رکھا جب قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں کبھی مجھے مضمحل نظر نہیں آئے۔ دونوں نے پوری سنجیدگی، جگر کاوی اور دل جمعی کے ساتھ تحقیق کے تقاضوں کو پورا کیا اور دونوں نے یاد رہ جانے والا تحقیقی کام کیا۔

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی کا تعلق ایک ادب نواز اور مردم خیز خطے ردولوی سے ہے۔ چونکہ استاد محترم پروفیسر شبیہ الحسن مرحوم کے ساتھ عشرۂ محرم میں مجھے ردولی لے جانے کا شرف حاصل رہا ہے اور مسعود ردولوی صاحب کے استاد جناب جعفر مہدی رزم صاحب کی بارگاہ میں بھی میری رسائی رہی ہے اس لئے

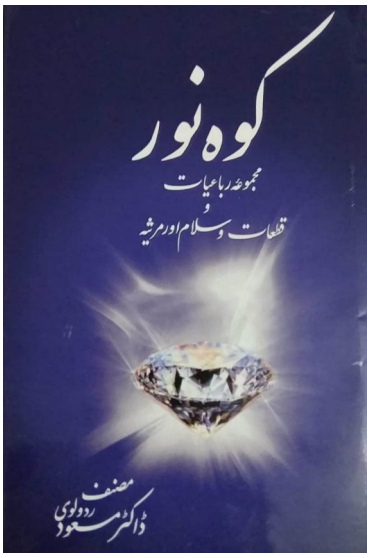

مبصر : ڈاکٹر انیس اشفاق

قیمت : 350 روپئے

ناشر : سید منصور حسن، بالا گنج لکھنؤ

ملنے کا پتہ

تنظیم المکاتب، گولہ گنج لکھنؤ

میں کہہ سکتا ہوں کہ ردولی کی فضاؤں میں جگہ جگہ شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود ردولوی کی تربیت ایسی شاعرانہ فضا میں ہوئی اور ان میں استاد بھی رزم ردولوی کا ساتھ ملا جو نہ صرف کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر بلکہ عروض کی پیچدار راہوں سے اچھی طرح واقف تو مسعود ردولوی نے آنکھ شاعرانہ ماحول میں کھولی، مزاج شاعرانہ پایا، شاگردی ایک بڑے اور رموز شعر سے واقف شاعر کی ملی، پیش خوانی اور مرثیہ خوانی نے طبیعت میں آمادگی پیدا کی سو انہوں نے شاعری کی طرف مائل ہوکر ۱۷ سلاموں، ۵۵ قطعوں، پانچ مرثیوں اور بیس رباعیوں پر مشتمل ایک ایسے شعری مجموعے کی تخلیق کر ڈالی جس کی یقینا پڑھنے والوں میں پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر مسعود ردولوی نے رثائی شاعری کے جن میدانوں میں قدم رکھا ہے، ان میں رباعی اور مرثئے کا کہنا آسان نہیں۔ رباعی میں تو پختہ کار شاعروں سے بھی عروضی لغزشیں ہو جاتی ہیں اور وہ ٹھوکر کھا جاتے ہیں لیکن مرثیہ گوئی کی دعا کے لئے مسعود ردولوی صاحب نے جو رباعی کہی ہے اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں اس راہ میں سنبھل کر قدم رکھنے کا ہنر آتا ہے اور وہ رباعی یہ ہے:

دی مرثیہ خوانی کو جو عزت یا رب
ہے تیری عطا تیری عنایت یا رب
لیکن یہ سہارا دوسروں کا کب تک
دے مرثیہ گوئی کی بھی قدرت یا رب

قطعہ نگاری بھی اب ہماری شاعری میں برائے نام رہ گئی ہے۔ کوئی شاعر اس میدان میں دیر تک اپنے قدم نہیں جماتا۔ ڈاکٹر مسعود ردولوی نے پچپن قطعات کہہ کر یہ بتا دیا کہ اسلام اور مرثیہ کی طرح وہ اس میدان کو بھی جیت لینا جانتے ہیں۔ ان کی قطعہ نگاری دیکھ لیجئے:

برہم کرو نہ فاتح بدر و حنین کو
تکلیف دو نہ فاطمہؑ کے دل کے چین کو
جاں دی ہے حق کے واسطے سبط رسولؐ نے
ٹکراؤ مت نماز سے ذکر حسینؑ کو

مجھے یقین ہے کہ چار سو سے زائد صفحات کو محیط ان کا یہ مجموعہ رثائی شاعری کے سنجیدہ قارئین سے ضرور داد حاصل کرے گا۔

❑❑❑

پروفیسر انیس اشفاق موجودہ عہد کی ایک رجحان ساز شخصیت ہیں، ان کا شمار اردو زبان وادب کے صف اول کے دانشوروں میں ہوتا ہے، نقد وتنقید کے حوالے سے ان کی بیشتر کتابیں نصابی ماخذات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ شعروادب میں بھی اپنی ایک نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ ابھی کچھ ماہ قبل پے در پے ان کے دو شعری مجموعہ اشاعت پذیر ہوئے، غزلوں کا مجموعہ ''ایک نیزہ خون دل'' کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''صبح خورشید زوال، نوائے نینوا'' ہے، یہ شعری مجموعہ خالص رثائی ادب کی اہم صنف سخن سلام گوئی پر مشتمل ہے۔ پروفیسر انیس اشفاق نے س ''سلام گوئی جیسی مقدس اور جاں سوز صنف سخن میں اپنی خلاقانہ بصیرت سے ایک ایسی نہج کو استوار کیا ہے، جس پر چلنا ہر کس و ناکس کے وسعت امکان میں نہیں، اس لئے ان کے ''سلام'' کا یہ مجموعہ ہر زاویہ سے اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے۔

جہاں تک سلام گوئی کی بات ہے تو یہ صنف قدیم ہونے کے باوجود اپنے اندر جدید ترین موضوعات کے ساتھ ایک صحت مند روایت کا بھی امکان رکھتی ہے۔ لیکن ان موضوعات کو برتنے کے لئے بھرپور ذہنی تخلیقی ہنرمندیوں کی متقاضی ضرور ہے۔ حالانکہ سلام کا ارتقاء ذیلی صنف کے طور پر ہوا مگر بعد میں اس کی ذیلی صنف کے بجائے ایک ادبی صنف کی حیثیت سے شناخت قائم ہوگئی۔ سلام گوئی کے آغاز میں سلام السلام مجرئی اور مجرا جیسے الفاظ سلام کے لئے نہ صرف ضروری خیال کئے جاتے تھے بلکہ جزولازم کی حیثیت رکھتے تھے مگر سودا نے اپنی تجدد پسند طبیعت کے باعث صنف سلام میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ ان کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنی فنی ہنرمندی اور فکری ثروت مندی سے اس صنف کی نئی صورت گری کچھ اس طرح کی کہ نہ صرف انھیں کے عہد میں سلام گویوں کی ایک پوری نسل کامیاب ہوگئی جنہوں نے سلام کو اپنے شعری اظہار کے لئے ایک مستقل ذریعہ قرار دیا۔

ہر زبان کے ادب نے کربلا کے موضوع سے فکری روشنی حاصل کی ہے۔ اردو زبان وادب بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا ہے۔ اردو زبان وادب نے بھی موضوعات کربلا کی فکری میراث ایران وعرب کے ادبی ذخیرے سے ہی حاصل کی ہیں، مگر اردو شاعری نے اس موضوع کو کچھ اس طرح اپنے وجود میں پیوست کرلیا ہے کہ کربلا کے تعلق سے اردو شاعری میں بہت سی اصناف وجود میں آگئیں۔ تاریخ ادب کے جائزے سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ مرثیہ سلام نوحہ اور منقبت جیسی اصناف کی تجسیم وتخلیق کربلا کے بغیر ناممکن تھی۔

معاصر عہد میں سلام گویوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ مگر اس فہرست میں بہت کم ایسے نام ہوں گے جو اس صنف کے ساتھ انصاف کرسکے ہوں کیونکہ یہ شعراء بدلتے ہوئے شعری وسائل اور نئے الفاظ وتراکیب اور ان

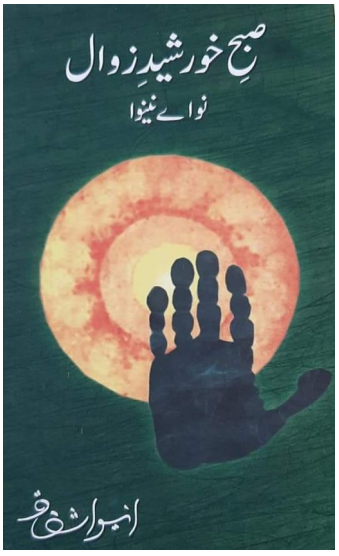

مبصر : ڈاکٹر ظفر النقی

قیمت : 200 روپے

ناشر : انیس اشفاق

ملنے کا پتہ

دانش محل، امین آباد، لکھنؤ و دیگر کتب فروش

کے برتنے کے ہنر سے مکمل آگاہی نہیں رکھتے ہیں۔ ایسے میں انیس اشفاق کے سلام کا مجموعہ ''صبح خورشید زوال'' میں نہ صرف روایتی سلام سے انحراف کیا گیا ہے بلکہ زبان وبیان اور موضوعات کی سطح نئے تجربے بھی کئے گئے ہیں۔ جس کے باعث ان کے سلام میں ایک نیا ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے سلام میں غزل کے ڈکشن اور الفاظ و تراکیب اور استعارات وتشبیہات کی پرچھائیاں صاف دکھائی پڑتی ہیں کیونکہ ان کے سلام کا مکمل اسلوب غزل کی خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اسی لئے ان کے سلام میں ایسے بہت سے اشعار مل جائیں گے جو انفرادی طور پر غزل کے شعروں سے مماثلت رکھتے ہیں مگر پورے سلام کی رثائی فضا اور کربلائی کرداروں کی شمولیت ایسے اشعار کو ایک نئے معنوی تناظر عطا کردیتے ہیں۔ انیس اشفاق کے یہاں الفاظ برتنے کا جو سلیقہ نظر آتا ہے وہ معاصر عہد کے روایتی سلام گویوں کے یہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اسی لئے انیس اشفاق کے سلام نہ صرف کربلا کی مخصوص فضا کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ موجودہ عہد کی سماجی و سیاسی صورتحال کے تناظر میں کربلا کے کرداروں کی اہمیت و عظمت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

انیس اشفاق کے سلام خالص رثائی اور روایتی موضوعات کے ساتھ عصری موضوعات ومسائل اور سیاسی و سماجی معاملات وواقعات کو بھی اپنے درون میں سمیٹ لیتا ہے۔ اور یوں اپنے عہد کے یزیدوں اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ دراصل انیس اشفاق کے سلام کے بہت سے شعروں میں کربلا کے کرداروں اور وقوعوں کے پس منظر میں موجودہ عہد کی صورتحال کی ترجمانی کی گئی ہے۔

انیس اشفاق اپنے سلام میں نئے شعری پیکروں کی تعمیر وتشکیل کے لئے کربلا کے مختلف کرداروں اور شخصیتوں کی مختلف معنوی جہتوں کو منور کرنے ایک کل کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ خاص طور سے جناب حر کے کردار اور شخصیت کی مختلف جہتوں اور طرفوں کو منور کرنے لئے زاویہ فکر کے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں تاکہ قاری کے ذہن میں حرؑ کی مکمل صورت روشن ہوسکے۔

انیس اشفاق کے سلام کے اس مجموعے میں رثائی موضوعات کی ایک نئی دنیا منور ہوتی ہے جو موجودہ عہد میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے لہذا رثائی ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے یہ مجموعہ کسی نایاب تحفے سے کم نہیں ہے اس مجموعے کی طباعت کو دیکھتے ہوئے 150 روپے کی قیمت زیادہ نہیں ہے۔ یہ لکھنؤ کے تمام مذہبی اور ادبی کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔

❑❑❑

سردست کتاب گلدستہ مودسید عباد حسین عابد ی عابد سلطانپوری کی کے مدحیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ ۱۰۰ صفحات کی اس کتاب میں نعت، حمد، منقبت کے علاوہ غدیر، مباہلہ جیسے اہم اسلامی واقعات پر بھی مصنف نے منظوم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے جذبات وعقائد کے علاوہ ان کے مشاہدے اور تجربات کی بھی غمازی کرتی ہے اس کتاب میں ایک اہم نظم 'لکھنؤ' (صفحہ 84) شامل ہے۔ اس نظم مختصر سی نظم میں میں شاعر نے لکھنؤ کی عمارت، یہاں کی تہذیب یہاں کی ہستیاں کا ذکر عقیدت مندی کے ساتھ کیا ہے بطور مثال چند شعر ملاحظہ فرمائیں

پوچھتے ہو تو سنو مجھ سے کہ کیا ہے لکھنؤ
یوں سمجھ لو بس کہ عکس کربلا ہے لکھنؤ
ہے جو سلطان المدارس، ناظمیہ و واعظین
ان کی تعلیمات سے پھولا پھلا ہے لکھنؤ

کسی بھی شاعر کے لئے نعت ومنقبت کہنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ اس صنف میں شاعر کا محبوب کوئی خوبصورت نازنین نہیں ہوتی بلکہ بافضیلت و باکمال اور منتخب من اللہ اشخاص ہوتے ہیں جن کی بارگاہ میں لب کشائی کے وقت ہر دم یہ فکر رہتی ہے کہ آیا یہ لفظ اور یہ خیال شایان شانِ محبوب ہے بھی یا نہیں۔ شاید اسی لئے شاعر نے کہا تھا کہ

باخدا دیوانہ باشی
با محمد ہوشیار

عابد سلطانپوری چونکہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور محب رسول وآل رسول رہا ہے خود مصنف نے ہوش سنبھالتے ہی ایسی سرزمیں پر پرورش پائی جہاں کی فضا میں ہمہ وقت مجلس ومیلاد اور واعظ تقریر کی صدا گونجتی رہتی ہے لہٰذا ان کی شاعری میں شان رسالت اور احترام اہل بیتؑ دونوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے الفاظ وخیالات کا انتخاب کیا گیا ہے۔

شاعری میں خواہ وہ مدحیہ ہو یا غزلیہ ذاتی تجربات ومشاہدات کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے۔ تخلیق کار اپنی شاعری کی کتنی ہی حفاظت کیوں نہ کرے مگر غیر شعوری طور پر اس کے تجربات ومشاہدات کی رمق اس کی شاعری جھلکنے لگتی ہے۔ گلدستہ مودت میں بھی ایسے کئی کلام ہیں جن کی قرأت سے مصنف کے تجربات کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'فطرت بشریت' (صفحہ 67) عروج وزوال (صفحہ 64) اور نیرنگئ بشر (صفحہ 81) وغیرہ میں حقیقی دنیا کا ستھرا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔

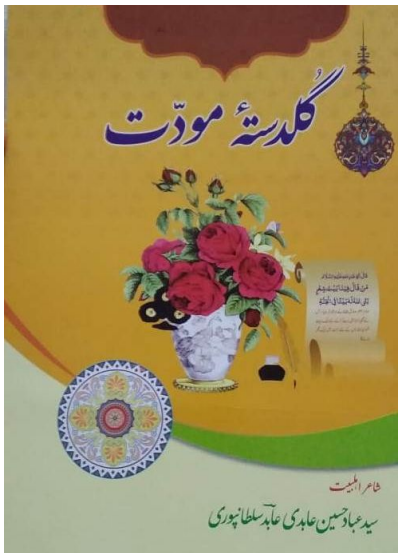

مبصر : موسیٰ رضا
قیمت : 80 روپئے
ناشر : عباد حسین عابدی عابد سلطانپوری

ملنے کا پتہ

صحیفہ بک سینٹر، خواجہ ٹاور، بزازہ، چوک، لکھنؤ

زیر نظر کتاب میں کربلا کے واقعات اور مصائب اسیران شہدا کے نمائندہ اشعار مختلف نظموں میں موجود ہیں اس کے علاوہ تین کلام خاص طور پر اسی عنوان کے تحت شامل کئے گئے ہیں۔ ان منظومات میں کربلا کے عظیم غم کی عکاسی مصنف نے نہایت سادہ زبان میں کی ہے مثلاً امام حسینؑ کی بے کسی پر یہ شعر دیکھیں:

کوئی پیرو جواں نہیں باقی
شہؑ کی امداد کو اب آتا کون

اس شعر کو بھی ملاحظہ فرمائے جس میں لاش حسینؑ کے بے گور وکفن ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے

سب کے لاشے اٹھا کے لائے حسینؑ
لاش شبیرؑ کی اٹھاتا کون

نظم الوداع کیسے کہوں میں پوری فضا مغموم اور جذبات سے پر ہے، لفظ 'الوداع کیسے کہوں' ہر شعر کے دوسرے مصرع سے ملحق ہے جو اس نظم کو جذباتی شدت پیدا کرتی ہے یہ اشعار دیکھیں

راہ حق میں سر کٹا کے سو گئے جو دشت میں
ان شہیدان وفا کو الوداع کیسے کہوں
باپ کے ہاتھوں پہ جو تشنہ دہن مارا گیا
پھول سے اس مہ لقا کو الوداع کیسے کہوں

سید عباد حسین عابدی عابدؔ سلطانپوری کی شاعری رسول اور آل رسول کی محبت کا نتیجہ ہے اس لئے ادبی فنی گری کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اس کے باوجود ان کے کلام میں جگہ جگہ استعارے، تشبیہات، رعایت لفظی وغیرہ کے اچھے نمونے دیکھنے ملتے ہیں مثال کے طور پر رعایت لفظ کی عمدہ مثال اس شعر میں دیکھے جو انھوں نے 'معراج نبی' (صفحہ 18) میں شامل کیا ہے

نور ہے منزل سواری نور کی مہمان نور
محو حیرت ہو کے خود شمس وقمر دیکھا کئے

پہلے مصرع میں نور کا تذکرہ اور پھر اس نور کی تابناکی کے بیان میں شمس وقمر رعایت نے شعر کو حسن عطا کر دیا ہے۔ اس سے قبل مصنف کی مدحیہ شاعری کا ایک مجموعہ 'اشک غم' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے جسے کافی مقبولیت ملی، مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ اس کتاب کو بھی لوگ پسند کریں گے۔ میں اس مجموعہ کی اشاعت پر سید عباد حسین عابدؔ سلطانپوری صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

❑❑❑

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا لا یونیورسٹی منعقد ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ امتحان ۲۰۱۹ء
کے ہونہار طلباء کی اعزازی تقریب میں ایک طالبہ کو اعزاز سے نوازتے ہوئے (یکم ستمبر ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ امبیڈکر نگر میں ایک خاتون کو
وزیر اعظم دیہی رہائشی اسکیم کی علامتی چابی دیتے ہوئے (۷ر ستمبر ۲۰۱۹ء)

غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے زیر اہتمام شامِ شہر یاراں کے موقع پر ڈاکٹر عطیہ رئیس کی کتاب 'اختصاص تنقید' کا رسم اجرا کرتے ہوئے بائیں سے دائیں جانب
ڈاکٹر امتیاز احمد، سید عاصم رضا (ایڈیٹر نیا دور لکھنؤ)، ڈاکٹر شارب ردولوی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر کاظم و ڈاکٹر عطیہ (۲۲ر اگست ۲۰۱۹ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

ہندوستان کے وزیراعظم جناب نریندر مودی اور اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
متھرا میں منعقد پروگرام 'صفائی ہی خدمت' کے افتتاح کے موقع پر (۱۱ر ستمبر ۲۰۱۹ء)

ہندوستان کے وزیراعظم جناب نریندر مودی اور اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
متھرا میں منعقد پروگرام کے درمیان آپس میں محو گفتگو (۱۱ر ستمبر ۲۰۱۹ء)

वर्ष : 74 अंक 5
सितम्बर 2019
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, **f'kf'kj]** निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सैयद आसिम रज़ा**